

افکارِ عالم

فکر اسلامی کی روشنی میں

علمی، ادبی تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ

جلد اول

مولانا نظام الدین اسیر ادروی

۳۲۷۵۵۳
شیخ الہند اکیڈمی، دار العلوم دیوبند

۴- مذہب سے بتدریج دوری اور بیگانگی (فریب تمدن ص۳۸۲، صدق لکھنؤ ۱۳؍جون ۱۹۵۸ء) میں نے اپنی اور اپنے مذہب اسلام کی بات بتادی یورپ کے دانشوروں کے اعتراف شکست کا اعلان آپ کے سامنے پیش کردیا، کیا یہ حقائق آپ کو صرط مستقیم دکھانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔"

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ.

مسلمانوں کا مسیحا

سر سید ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت واقتدار کے قلعہ کا ایک ایک کنگرہ گرتا جارہا تھا، قلعہ کی فصیلیں اپنی جگہ سے سرک رہی تھیں اور ایک اجنبی طاقت کی مسلسل یلغاروں سے ٹوٹتی جارہی تھیں پورا ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے عقابوں کے آہنی پنجوں میں سہمے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا، اس کی قوت پرواز اس سے سلب کی جاچکی تھی، اس کے جسم کا لہو بوند بوند کر کے چوسا جارہا تھا، بس ابھی تک اس کی گردن مروڑی نہیں گئی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفید فام سپاہیوں نے ۱۷۹۶ء میں میسور کے سلطان ٹیپو کو جس دن شکست دی اسی دن ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی ایک مضبوط بنیاد پڑگئی، انھوں نے اپنی سوداگری کے زمانہ میں یہ تجربہ کیا تھا کہ ہندوستان میں عام اشیاء کی طرح انسانوں کا ضمیر اور ایمان بھی بکتا ہے اور خریدا جاسکتا ہے، انھوں نے اس کا تجربہ میسور اور بنگال میں کیا اور کامیاب ثابت ہوئے۔

میسور میں میر صادق، میر قاسم، میر غلام علی لنگڑا، میر قمر الدین اور پورنیا مل گئے جنھوں نے حکومت میں ذمہ دارانہ عہدوں پر رہتے ہوئے اپنی مادر وطن اور اپنے مثالی حکمراں سلطان ٹیپو سے غداری کی، اپنا ایمان اپنا ضمیر ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں کے ہاتھوں میں بیچ دیا، دوسری طرف بنگال میں ایک بدنام زمانہ غدار میر جعفر دریافت

ہوا اور اس کو آلۂ کار بنا کر سراج الدولہ کے سینہ میں خنجر بھونک دیا، اس طرح کی غداری اور انگریزوں سے بے لچک وفاداری کو غیرت مند مسلمان کس نگاہ سے دیکھ رہا تھے، اس کی ترجمانی ڈاکٹر اقبال نے صرف ایک شعر میں کردی، جو آج ضرب المثل ہے ؎

ننگِ ایماں، ننگِ دیں، ننگِ وطن ❁ جعفر از بنگال وصادق از دکن

جنوب میں سب سے مضبوط بلکہ آہنی شخصیت نواب حیدر علی اور اس کے بعد سلطان ٹیپو کی تھی۔ سلطان ٹیپو نے مسلسل خونریز جنگوں میں انگریزوں کو شکست فاش دی اور ایک بار تو اس نے ساحل سمندر تک ان کو کھدیڑ دیا تھا ان کے افسران نے جہازوں میں پناہ لی تھی، ان کے مشہور جرنلوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا تھا، ان کی طاقت کو جنوب میں اس نے تہس نہس اور پارہ پارہ کردیا تھا، ان کی فوجوں پر مایوسی طاری تھی۔

جب انگریزوں نے دیکھا کہ سلطان ٹیپو کو میدانِ جنگ میں شکست دینا ممکن نہیں تو انھوں نے اپنے تجربات سے فائدہ اٹھایا کہ ہندوستان میں انسانوں کا ایمان اور ضمیر بھی خریدا جاسکتا ہے اور پھر انھوں نے اسی پہلو پر سرگرمی سے کام شروع کردیا، میر صادق جو سلطان ٹیپو کا وزیر اعظم تھا اس سے انگریزوں نے ساز باز کی، پھر اس کے بہت سے فوجی افسران کو اپنے آقا سے غداری پر آمادہ کرلیا اور پھر میدان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں رہا اور مئی ۱۷۹۹ء میں غداروں کی سازش سے خاص دار السلطنت میں سلطان ٹیپو بے یار ومددگار رہ گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیڑیوں نے اس کو بیدردی سے قلعہ کے اندر ذبح کردیا۔

فتوحات کا سیلاب

سلطان ٹیپو پر فتح حاصل کر کے انگریزوں نے اس آہنی پھاٹک کو توڑ دیا جو ہندوستان پر قبضہ کرنے کی راہ میں حائل تھا جیسا کہ کمپنی کے مقبوضات کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے۔

میسور کی فتح کے دو سال بعد ۱۸۰۰ء میں مضافات میسور میں کڑپہ، کرنول، بلاری، اننت پور، تنجاور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، دوسرے سال ۱۸۰۱ء میں کرناٹک کے نواب کو جس نے انگریزوں کی مدد سے حکومت پائی تھی نکال کر مدراس بھیج دیا اور خود کرناٹک پر قبضہ کر لیا، اسی سال صوبجات اودھ کمپنی کے قبضہ و اختیار میں آ گئے، دوسرے ہی سال ۱۸۰۲ء میں مرہٹی سلطنت جو اب تک ناقابل تسخیر مانی جا رہی تھی اس کا انگریزوں نے خاتمہ کر دیا، دربار پونا میں انگریزی ریزیڈنٹ رہنے لگا اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا تھا، اسی سال بڑودہ اور گجرات کو بھی انگریزوں نے اپنے شکنجہ میں لے لیا اور اس کے بعد ۱۸۰۳ء میں حیدرآباد ایک بے بس کبوتر کی طرح انگریزی باز کے چنگلوں میں پھڑ پھڑانے لگا، نواب حیدرآباد انگریزوں کا باجگذار بن گیا، اسی سال ناگپور پر قبضہ کر کے کمپنی نے انگریز مشیر کار وہاں مسلط کر دیا، یہ سال کمپنی کی فتوحات کا سنہرا سال بن گیا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی سال بندیل کھنڈ، آگرہ، دہلی، جے پور، جودھپور اور گوالیار پر انگریز حکمران ہو گئے، ۱۸۱۳ء میں مراشش پر قبضہ ہوا اور اسی سال نیپال کو اپنے اختیار میں لے کر وہاں ریزیڈنٹ مقرر کر دیا گیا ۱۸۱۷ء میں پہاڑی ریاستوں میں شملہ، مسوری، نینی تال، لندھوری بھی انگریزوں کے قبضہ میں آ گئیں، اسی سال ناگپور سے ریزیڈنٹ کو واپس بلا لیا گیا اور براہ راست اس کو اپنے اختیار میں لے لیا گیا، اب انگریزوں کی طاقت ناقابل شکست بن چکی تھی، سمجھوتہ کی پالیسی ترک کر کے اپنی قوت کا بھرپور مظاہرہ کیا جانے لگا اور جہاں بھی ضرورت سمجھی گئی وہاں کے ریزیڈنٹ کو بلا لیا گیا اور براہ راست اس کو اپنی حکومت کے ماتحت کر لیا ۱۸۱۸ء میں بھی یہی کیا گیا، پونا کے پیشوا کو معزول کر کے ملک پر قبضہ کر لیا گیا اور ۱۸۱۹ء میں حدود ہند کے آخری کنارے پر آسام اور برما پر بھی فتح حاصل کر کے ان مقامات پر اپنے ریزیڈنٹ مقرر کر دیئے گئے اس طرح انگریز باری باری کر کے پورے ملک پر قابض ہو گئے، صرف دہلی کے لال قلعہ میں مغلیہ سلطنت کا آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر بے دست و پا تخت حکومت پر تھا، لال قلعہ میں کئی انگریز

مشیر کار مقرر تھے جن کی مرضی کے بغیر بادشاہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سرسید پردۂ عدم سے عالم وجود میں آئے، ہر انسان کی نشو ونما کا جو ماحول ہوتا ہے، اس کے گرد و پیش جو حالات ہوتے ہیں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے، اس کا ذہن و مزاج اسی طرح افکار و خیالات کے سانچے میں ڈھلتا چلا جاتا ہے جو اس کے گرد و پیش اور ماحول کا تقاضا ہوتا ہے، اس انقلاب نے ہندوستانی معاشرے کو تہ و بالا کر دیا تھا ہر شخص کو بالخصوص مسلمانوں کے متوسط طبقہ کے ہر فرد کو اپنا مستقبل سخت تاریک نظر آ رہا تھا، سرسید بھی انھیں لوگوں میں سے تھے اس لئے وہ اس سے کیسے مستثنیٰ رہ سکتے تھے۔

بجھتا ہوا چراغ اور دمکتا ہوا سورج

سرسیّد کے والد کو لال قلعہ سے تنخواہ ملتی تھی اس لئے یہ خاندان رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا لیکن والد کے انتقال کے بعد قلعہ کی تنخواہ بند ہو گئی، تھوڑی سی رقم وظیفہ کے نام سے ملتی تھی، اب سرسید کی عمر ۲۲ سال کی ہو چکی تھی، اس لئے ذریعہ معاش کی تلاش ہوئی، انھوں نے سلطنت مغلیہ کے جھلملاتے ہوئے چراغ کی سمت ایک نظر ڈالی جس کا تیل ختم ہو چکا تھا، صرف بتی جل رہی تھی، کوئی بھی ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس چراغ کو گل کرنے کے لئے کافی تھا، انھوں نے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ سحر کی طرف سے بے نیازی کے ساتھ رُخ پھیر لیا کہ جو چراغ لال قلعہ کی فصیلوں تک کو روشن نہیں کر سکتا وہ مرے گھر کو کیا اُجالا دے سکتا ہے، اس کے بالمقابل ان کے سامنے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقبال کا دمکتا ہوا سورج تھا جس کی تیز روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اس لئے انھوں نے اسی سورج سے کچھ کرنیں لے کر اپنے گھر کو بقعۂ نور بنانے کا فیصلہ کر لیا، اسی دن زندگی کے آخری لمحہ تک ان کا قبلۂ مقصود ایک ہی رہا، ان کی جبین نیاز کے لئے ایک ہی سنگ در اور کعبۂ مراد متعین ہو گیا اور پھر پوری زندگی میں کوئی بھی ایسا لمحہ نہیں آیا کہ انھوں نے دائیں بائیں دیکھا ہو جو سر جس چوکھٹ پر جھک گیا اس سے پوری

زندگی نہیں اٹھایا۔

سرسید کے خالو خلیل اللہ خان دہلی میں صدر امین تھے، ان کے توسط سے سر رابرٹ ہملٹن سے تعارف ہوا اور انھیں کی توجہ سے فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں ان کو نائب منشی بنا دیا گیا، ان کی صلاحیت اور انگریزی حکومت سے بے لچک وفاداری کا تجربہ کرنے کے بعد ان کے لئے مسٹر ہملٹن نے عہدۂ منصفی کی سفارش کردی اور وہ منظور ہوگئی وہ اسی عہدے پر فتحپور سیکری، مین پوری آگرہ وغیرہ میں فائز رہے پھر آپ کا بجنور تبادلہ ہوگیا، وہاں دو سال سے زائد رہے اور یہیں سے ان کی زندگی کے اصل کارنامے ظہور میں آئے۔

قیام بجنور ہی کے زمانہ میں غدر ۱۸۵۷ء کا تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا، انگریزی حکومت نے اُسے غدر کے مکروہ نام سے ذکر کیا، وطن پرستوں نے اس کو تحریک آزادی کے آغاز اور جہاد حریت کے جوش آفریں لفظوں سے تعبیر کیا، یہ واقعہ ایک دہکتی ہوئی بھٹی ثابت ہوا، جس میں ہندوستان کے باشندوں کو تپا کر یہ جانچا گیا کہ کون کھرا سونا ہے اور کون کھوٹا؟ کیونکہ یہی تاریخ ہندوستان میں ہندوستانیوں یا مسلمانوں کی حکومت کی آخری تاریخ تھی، انگریزی حکومت جو ایک صدی سے ہندوستانیوں کی غلامی کی دستاویز لکھ رہی تھی مئی ۱۸۵۷ء میں اس دستاویز پر آخری مہر لگائی جارہی تھی، اسی واقعہ نے لوگوں کے درمیان حدِ فاصل کھینچ دی کہ کون وطن دوست ہے اور کون وطن دشمن؟

بہادر شاہ ظفر کا آخری انجام

اب تک لال قلعہ میں تختِ حکومت پر بہادر شاہ ظفر متمکن تھے، اگرچہ بادشاہت صرف نام کی تھی اختیارات مسلوب تھے، لیکن اب بھی یہ احساس باقی تھا کہ ہندوستان کی بادشاہت ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہے، اس ہنگامہ میں حالات کے دباؤ سے مجبور ہوکر بہادر شاہ ظفر اپنے شاہزادوں کے ساتھ مقبرہ ہمایوں میں پناہ لیتا ہے، لیکن اب انگریز مسلمانوں کی حکومت کے نام ونشان کو یکسر مٹا دینے کا تہیہ کر چکا تھا، اس

لئے جنرل ہڈسن اپنے گھوڑ سوار دستے کے ساتھ مقبرہ ہمایوں پہنچا، بہادر شاہ ظفر اور شاہزادوں کو گرفتار کرکے لاتا ہے اور خونی گیٹ پر پہنچ کر شاہزادوں کی گردنیں قلم کرنے کا حکم دیتا ہے، ادھر شہزادوں کے سروں کو خونی دروازے پر لٹکایا جارہا ہے اُدھر جنرل ہڈسن دور کھڑا اس منظر کو دیکھ کر قہقہہ لگا رہا ہے، بہادر شاہ ظفر کو شہر بدر کرکے رنگون بھیج دیا گیا۔

انگریز کلکٹر کی حفاظت

ٹھیک اسی وقت سرسیّد اپنے ساتھ پولیس کا ایک مسلح دستہ لے کر بجنور کے انگریز کلکٹر کے بنگلے کا پہرہ دے رہے تھے کہ مسلمان اور ہندو جو آمادۂ بغاوت ہیں حملہ آور نہ ہوجائیں اور ایک انگریز کی جان چلی جائے۔ حالی لکھتے ہیں:

"بجنور کے کلکٹر مسٹر شکسپیر اور مسز شکسپیر سے سرسیّد کی بہت رسم وراہ تھی جب بجنور میں بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسز شکسپیر بہت گھبرائے، سرسیّد کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جاکر ان کی تشفی کی اور کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہئے، جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش آپ کی کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اس وقت گھبرانے میں مضائقہ نہیں[1]"

چند سطروں کے بعد حالی ہمیں بتاتے ہیں کہ سرسیّد عملی آدمی تھے جو کہا، اپنے عمل سے سچ کردکھایا، ان کے الفاظ ہیں:

"وہ تمام رات مسلح مع اور ہندوستانی افسروں کے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے اور ہر طرح عورتوں بچوں کو ڈھارس بندھواتے تھے، ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گذر جاتی تھی[2]"

۱ حیات جاوید از حالی شائع کردہ ترقی اردو بورڈ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۷۶، ۷۷۔
۲ حوالہ مذکور ص ۷۷۔

مسلمانوں کا قتلِ عام

انگریزوں نے جب دہلی کے باغیوں پر قابو پالیا تو انھوں نے دہلی کی چاندنی چوک میں معزز مسلمانوں رؤسا، اُمراء، جاگیردار، علماء شعراء اور مشائخ کو گرفتار کر کے بلا امتیاز اور بلا ثبوت جرم پھانسیوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع کر دیا، سرایڈ روڈ ٹامسن نے اپنی کتاب ''دی آدر سائڈ آف دی ماڈل'' میں درجنوں رونگٹے کھڑا کر دینے والے واقعات لکھے ہیں، وہ معزز مسلمانوں کو عام دستور کے مطابق گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی دیتے تھے اور کبھی کبھی سزا کے نت نئے طریقے ایجاد کرتے تھے، مذکورہ بالا انگریز نے دل دہلا دینے والے طریقوں سے ہمیں روشناس کرایا ہے، سزا دینے کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ کسی درخت کی شاخ میں رسی کا پھندا باندھ دیا، مسلمان مجرم کو ہاتھی پر بٹھایا، درخت کے نیچے لے جا کر اس کی گردن میں پھندا ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھا دیا، مجرم اسی پھندے میں جھول جاتا، زبان منہ سے نکل کر باہر آجاتی، جان کنی کا وہ دردناک منظر ہوتا کہ وہ مرغِ بسمل کی طرح ناچتا اور سکڑ کر انگریزی کا 8 بن جاتا تھا، دوسرا طریقہ خاص خاص اور ممتاز مسلمانوں کو سزا دینے کا یہ اختیار کیا تھا کہ اس مسلمان کو توپ کے منہ پر رسیوں سے جکڑ کر باندھ دیا جاتا اور پھر توپ چلا دی جاتی، اس مسلمان کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں اڑ جاتا اور اس کا خون فضا سے زمین پر اس طرح گرتا جیسے خون کی بارش ہو رہی ہے، یہ ڈرامہ ہزاروں انگریزوں، عورتوں اور بچوں کے سامنے کھیلا جاتا تھا، سزا کے ان ہیبتناک طریقوں کو دیکھ کر اور سن کر پورا ہندوستان ڈرے ہوئے بچے کی طرح سہما ہوا تھا، انگریز اس وقت خون آشام بھیڑیا بن گیا تھا، ان کی درندگی و بہیمیت اور ان کی وحشت و بربریت کا کیا عالم تھا؟ اس کی سیکڑوں مثالوں میں سے صرف ایک مثال آپ کے سامنے پیش ہے۔

''انگریزوں نے کوچہ چیلان دہلی سے چودہ سو مسلمانوں کو گرفتار کیا جس میں مولانا امام بخش صہبائی بھی تھے جو دہلی کے ایک مشہور اور جید عالم اور مشہور

ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے ساتھیوں مین سے تھے مولانا موصوف کے دو نوجوان صاحبزادے بھی گرفتاروں میں تھے، ان تمام بے قصور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کر کے بھیڑ بکری کی طرح ہانک کر جمنا پارک لے گئے اور ایک قطار میں کھڑا کر کے سب کو گولی ماردی اور لاشوں کو جمنا پارک میں پھینک دیا[1]''

انگریزوں کی حفاظت

ٹھیک اسی وقت بجنور میں جہاں سرسیّد تعینات تھے آٹھ دس انگریزوں اور ان کے بیوی بچوں کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے، حالی ہمیں سرسیّد کے لچک وفاداری کی یہ داستان سناتے ہیں:

''وہ رات جب کہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یورپین مرد عورتیں اور بچے جمع تھے اور ایک جماعت کثیر جو بظاہر حفاظت کے لئے فراہم ہوئی تھی ان کی نیتیں بگڑ گئیں اور کچھ فوج اور توپخانہ باغیوں کا ان کی کمک کے لئے مرادآباد سے عنقریب آنے والا تھا نہایت سخت تھی، اس روز سب کے مارے جانے میں کچھ شبہ نہ تھا، ایسے نازک وقت میں سرسیّد تنہا اس خودسر جماعت کے مجمع میں گئے اور نواب محمود خاں سے جو ان کا سرغنہ تھا گفتگو کی اور کہا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا بہتر یہی ہے کہ ان کو صحیح وسالم یہاں سے جانے دو......
اور سب انگریزوں کو اسی وقت اس خونخوار مجمع سے نکال کر روڑکی روانہ کر دیا[2]''

سرسیّد کا نقطۂ نگاہ

دراصل سرسیّد کا نقطۂ نگاہ عام مسلمانوں سے جداگانہ تھا، وہ انگریزوں کو دوست

1. تحریک آزادی اور مسلمان ناشر دارالمولفین دیوبند ص ۸۰۔
2. حیات جاوید از حالی مطبوعہ ترقی اُردو بورڈ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۷۷۔

سمجھتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کو دشمن اور گردن زدنی کے سوا کچھ نہیں سمجھتے تھے، انگریزوں کا ہر طرزِ عمل صحیح اور درست، حق وانصاف کے مطابق تھا اور مسلمانوں کا انگریزوں کے مقابلہ میں ہر عمل لائق مذمت اور قابل نفرت تھا، حتی کہ مسلمانوں کے اقتدار اور حکومت کے بجائے انگریزوں کی حکومت کو مسلمانوں کے لئے رحمت وبرکت تصور کرتے تھے، اس کے لئے وہ قرآن وحدیث کو استعمال کرتے تھے، وہ مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت اور ان سے مکمل وفاداری کا سبق پڑھاتے تھے، انگریزوں سے نفرت ودشمنی اور بغاوت کو مسلمانوں کا ناقابل معافی جرم تصور کرتے تھے، وہ اپنے مقالہ ''امام اور امامت'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''السلطان ظل اللّٰہ فی الارض ...... حدیث میں سلطان کا لفظ بغیر قید کے آیا ہے، بس وہ سلطان خواہ مسلمان ہو، خواہ یہودی ہو، خواہ عیسائی ہو، خواہ آتش پرست ہو اس کے ساتھ اس کی رعیت کو اس طرح پیش آنا لازم ہے کہ جس طرح کہ حدیث میں بیان ہوا ہے......تمام مسلمان ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایہ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں، نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں[1]۔''

اس لئے ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ پر ان کو کوئی ملال نہیں ہوا، بلکہ ان کو ایک گونہ خوشی تھی، انگریزی غلبہ واقتدار کے لئے ان کے دل میں ایک جوش اور ولولہ تھا، ان کو بہادر شاہ ظفر جو مغلیہ سلطنت کا آخری بادشاہ تھا جس کو انگریزوں نے گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا تھا، یہ سب کچھ سرسیّد کی عین منشا کے مطابق تھا اس پر ان کو رنج نہیں خوشی تھی خود انھیں کے الفاظ ہیں:

''دلی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزومند نہ تھا، اس خاندان کی لغو اور بیہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں سے اس کی قدر ومنزلت گرادی تھی، ہاں، بیرونجات کے لوگ جو بادشاہ کے حالات اور حرکات اور اقتدار اور اختیار

[1] ''مقالات سرسیّد'' مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء ص ۵۷،۶ ۔

سے واقف نہ تھے بلاشبہ بادشاہ کی بڑی قدر سمجھتے تھے اور اس کو ہندوستان میں بادشاہ اور آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتظم ہندوستان جانتے تھے، الا خاص دہلی کے اور اس کے قرب وجوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے، باوجود ان سب باتوں کے ہندوستان کے سب آدمیوں کو بادشاہ کے معدوم ہونے سے کچھ بھی رنج نہ تھا[1]۔''

بہادر شاہ کو احمق اور پاگل کہہ کر سرسیّد اس کا مذاق اڑا کر اپنے دلی جذبے کا ثبوت دیتے ہیں، یہ عام ہندوستانیوں کے جذبات ورجحانات کی ترجمانی نہیں اپنے جذبات وخیالات کا اظہار ہے وہ حقیقتاً اپنے خیالات وجذبات کو عوام کے خیالات وجذبات کے نام سے پیش کرتے ہیں، کیونکہ ایک دوسری جگہ وہ خود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور لکھ دیا کہ:

''دلی کے معزول بادشاہ کا ایران کو فرمان لکھنا، ہم کچھ تعجب نہیں سمجھتے، دلی کے معزول بادشاہ کا حال یہ تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ ہندوستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے تو وہ اس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا۔ دلی کا معزول بادشاہ ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ مکھی مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے ایسے مالیخولیا والے آدمی نے کسی کے کہنے پر کوئی فرمان لکھ دیا ہو تو تعجب نہیں[2]۔''

ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت واقتدار کی آخری نشانی بہادر شاہ ظفر کے بارے میں جس شخص کے خیالات وجذبات یہ ہوں کیا اس سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی عظمت واقتدار کی حفاظت کا اس کے دل میں واہمہ بھی گذر سکتا ہے اہانت کے نقطہ نگاہ سے بہادر شاہ ظفر کو مالی خولیائی آدمی تحریر فرماتے ہیں اور سفید فام

[1] ''اسباب بغاوت ہند'' ضمیمہ حیات جاوید ص ۸۰۶۔

[2] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ جاوید از حالی ص ۸۰۹۔

چنگیزوں اور ہلاکوؤں کے جتھ کو ''آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے معزز لفظ سے یاد کرتے ہیں، سرسیّد کے دلی جذبات ان الفاظ میں بول رہے ہیں۔

مسلمان نمک حرام تھے

غدر ۱۸۵۷ء میں جن مشائخ، علماء، رؤساء، امراء اور عوام خواص نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی اور دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کرنے میں رکاوٹ ڈالی، دست بدست جنگ کی، شہید کئے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، کالے پانی بھیجے گئے، جنھوں نے اسلامی اقتدار کو بچانے کے لئے آخری تدبیر کے طور پر جہاد کے نام سے تلوار اٹھائی ان سارے مسلمانوں کی سرسیّد بڑے پرجوش لفظوں میں مذمت کرتے ہوئے ان کو نمک حرام تک کہتے ہیں، انھوں نے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے تین رسالے شائع کئے تھے، حالؔی نے انھیں رسالوں میں سے ایک رسالہ سے سرسیّد کے یہ جواہر پارے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں، سرسیّد تحریر فرماتے ہیں:

> ''جن مسلمانوں نے سرکار کی نمک حرامی کی اور بدخواہی کی، میں ان کا طرفدار نہیں ہوں، میں اُن سے بہت ناراض ہوں، اور ان کو حد سے زیادہ برا جانتا ہوں، کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہئے تھا...... اس ہنگامہ میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرنا چاہئے تھا، پھر جس نے ایسا نہیں کیا اس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی، اپنے مذہب کے خلاف کیا[1]۔''

وفاداری کا انعام اور صلہ

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے لاکھوں مسلمانوں کو نان شبینہ کا محتاج بنا دیا ہزاروں

[1] حیات جاوید از حالؔی شائع کردہ ترقی اردو بورڈ دہلی ص ۱۰۲،۱۰۳۔

رؤسا و امرا کو ہاتھ میں کاسۂ گدائی لینے پر مجبور کر دیا، رئیس زادیاں اور شہزادیاں یا تو لوگوں کے گھروں میں جھاڑو لگانے اور برتن مانجھنے کے لئے نوکرانیاں بن گئیں یا در در بھیک مانگنے لگیں گویا مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، اسی فضا اور ماحول میں انگریزوں نے سرسیّد کو ان کی وفاداری اور خدمات کا صلہ دینے کا اعلان کیا، انگریزوں کا یہ فیصلہ بجا تھا، ۵۷ء کے ہنگامہ میں جب انگریزوں کو ہندوستان کا ذرہ ذرہ اپنا دشمن نظر آتا تھا، ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں سے کوئی قوم ایسی نہ تھی جس سے ان کو خوف نہ لگا ہوا ہو، ان کو ہندوستان میں اپنی حکومت کا خواب بکھرتا ہوا نظر آرہا تھا، ایسے مایوس کن حالات میں سرسیّد جیسا وفادار و مخلص اور ذہین آدمی انگریزوں کو مل گیا، جس نے ان کے دلوں کو ڈھارس بندھائی اور اپنے دائرہ کار میں انگریزوں کی پوری پوری حفاظت کی، اس کے بھائی مسلمانوں کو انگریزوں نے بھیڑ بکری کی طرح ذبح کیا اور وہ مسکراتا رہا، اس کی آٹھ سو سالہ حکومت کے پرخچے اڑا دیئے گئے مگر اس کی پیشانی پر بل نہیں آیا، بلکہ خود بھی مسلمان بادشاہ کو پاگل اور دیوانہ کہہ کر انگریزوں کے طرز عمل کو اس نے خراج عقیدت پیش کیا، ایسے مخلص اور بے لچک وفاداری کرنے والے انسان کی خدمات کا صلہ نہ دیا جائے؟ یہ کیسے ممکن تھا، انگریزوں نے بڑی بڑی جاگیروں کی پیشکش کی لیکن سرسیّد نے بڑی بے نیازی سے ٹھکرا دیا یہ ان کے خلوص کی توہین تھی، ان کی مخلصانہ خدمات صلہ وانعام سے کہیں بلند تھیں، جاگیر قبول کرنے سے انکار سرسیّد کی تدبیر و فراست کی دلیل تھی، وہ انگریزوں سے زیادہ چالاک تھے اور کم از کم اتنا تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ جن انگریزوں سے سرسیّد کا واسطہ پڑا اور جن انگریز افسران کی ماتحتی میں وہ کام کر رہے تھے ان سب سے کہیں زیادہ ذہین و فطین تھے اس لئے ان کی طرف سے جاگیر کی پیشکش تھی اور سرسیّد کی طرف سے مسلسل انکار، کیونکہ مستقبل کی راہ میں یہ جاگیر سرسیّد کے لئے سب سے بڑی رُکاٹ بن سکتی تھی، اسی ہندوستان کی سرزمین پر ان کو زندگی بسر کرنی تھی، یہیں کے ہندو مسلمانوں میں ان کو کام کرنا تھا، جاگیر قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ یہاں کے

عوام کی نگاہوں سے گر جاتے اور پھر جاگیر کے بغیر بھی ان کی شاہانہ زندگی گذر سکتی تھی، انھوں نے نقد انعام کو جاگر پر ترجیح دی اور جاگیر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن انگریزی حکومت نے بطور اعزاز اور ان کے تقرب کے اظہار کے طور پر ان کو غدر میں انگریزوں کی بھرپور حمایت و مدد کرنے کا انعام اور صلہ دیا، خواجہ الطاف حسین حالیؔ ہمیں بتاتے ہیں:

''گورنمنٹ نے خود ان کی خدمات کی قدر کی اور اُنکے صلہ میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی[1]۔''

سر سیّد کو اپنی خدمات کا صلہ اور انعام لینے سے انکار نہیں تھا کیونکہ اس سے ان کی خدمات کا اعتراف ہوتا تھا اور یہ سب سے بڑی بات تھی کہ انگریزی گورنمنٹ سر سیّد کو اپنا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کرے، مگر جاگیر لے کر بدنام ہونا اور عوام میں رسوا ہونا منظور نہیں تھا۔ حالیؔ لکھتے ہیں:

''مسٹر شکسپیر رپورٹ کرنی چاہتے تھے کہ من جملہ تعلقہ چاندپور کے ایک معقول جائداد سیّد احمد خاں کو بعوض خدمات ایام غدر کے ملنی چاہئے مگر جب انھوں نے سر سیّد سے اس بات میں استمزاج لیا تو انھوں نے اس کے لینے سے انکار کیا انھوں نے سر سیّد سے کہا کہ نقد پنشن بہت کم مقرر ہوگی تو انھوں نے کہا کہ جو کچھ سرکار عنایت کرے اس کا احسان ہے مگر مجھ کو جائداد لینی منظور نہیں[2]۔''

طائرِ فکر کی بلند پروازی

غدر ۱۸۵۷ء کے سر سیّد چشم دید گواہ ہی نہیں تھے بلکہ اس دہکتی ہوئی آگ میں کود کر اپنے سرکاری فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے والے تھے، اس سلسلہ میں کئی بار ان کو اپنی جان داؤ پر لگانی پڑی اور ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا، بجنور میں جہاں وہ

[1] حیات جاوید از حالیؔ، ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۵۔
[2] حیات جاوید از حالیؔ ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۵۔

تعینات تھے کچھ انگریز اور ان کے بال بچے جن کی تعداد پندرہ بیس کے قریب رہی ہوگی ان کو محفوظ اور سلامت رکھنے اور ان کو بہ حفاظت انگریزوں کی فوجی چھاؤنی روڑکی پہنچانے میں جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا وہ سر سیّد جیسا وفادار اور انگریزی حکومت کا مخلص خیر خواہ ہی جھیل سکتا تھا، باغی مسلمانون سے سامنا ہونا اور ان کا انگریزوں کے قتل پر بضد ہونا اور سر سیّد کا پوری ہمت و جرأت سے باغیوں کے سردار محمود علی خاں سے گفتگو کر کے اس کو راضی کرنا کہ وہ انگریزوں کو قتل نہ کرے یہ سر سیّد ہی کا دل گردہ تھا، انھوں نے اپنی جرأت سے کام لے کر ان انگریزوں اور ان کے بال بچوں کو بغاوت کی اس دہکتی ہوئی بھٹی سے صاف نکال لیا اور ان کو روڑکی پہنچا کر اطمینان کی سانس لی جس کی وجہ سے بجنور کا انگریز کلکٹر شیکسپیر خاص طور پر بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنی حکومت سے سر سیّد کے لئے بہت بڑے انعام کی سفارش کرنی چاہی لیکن سر سیّد نے سوچا کہ یہ ایک ضلع کا حاکم معمولی انگریز ہے، اس کی خوشی و ناخوشی کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتی ہے اس لئے براہِ راست ایسٹ انڈیا کمپنی کے جلیل القدر ارکان اور ممبران پارلیمنٹ لندن کو اپنی خدمات سے متعارف کرنا زیادہ ضروری ہے، اس لئے جب وہ بجنور سے فرار کر کے بڑی بڑی مصیبتوں سے میرٹھ پہنچے تو انھیں رسالہ'' تاریخ سرکشی بجنور'' لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور اسے مرتب کر کے شائع بھی کر دیا، اس رسالہ کا خاص مقصد ان معزز مسلمانوں کی مخبری اور نشاندہی کرنی اور سزا دلانی تھی جنھوں نے بہت نمایاں طور پر انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا تھا۔ حالیؔ لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں غدر کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے بلا رو رعایت اور بے کم و کاست لکھے گئے ہیں، جن مسلمانوں نے باوجود متواتر فہمائشوں اور نصیحتوں اور تمام نشیب و فراز سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ کے احسانات کے سرکار سے بیوفائی کی تھی اور اس سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئے تھے ان کے حالات جوں کے توں بیان کر دیئے ہیں[1]۔''

[1] حیات جاوید از حالیؔ ص ۷۹، ۸۰ دیکھئے۔

اب سر سیّد کا مراد آباد ٹرانسفر ہوگیا، انگریز بغاوت پر قابو پاچکے تھے اور ہندوستانیوں کو کچل کر نیم جاں بنانے کے بعد مطمئن تھے اس لئے سر سیّد کو اب مراد آباد میں قدرے اطمینان نصیب ہوا، اور انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دینے کی تیاری کی اور وہ تھا ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' کا مرتب کرنا اور چھپوا کر لندن بھیجنا، یہ رسالہ سر سیّد نے اگر چہ کمال خیر خواہی اور بے لچک انگریزی گورنمنٹ سے وفاداری کے جذبے سے لکھا تھا لیکن ان کے لئے ایک آزمائش اور امتحان بن گیا، لندن میں اس کا انگریزی ترجمہ کیا گیا اور ارکان پارلیمنٹ میں تقسیم کیا گیا، رسالہ کا ردعمل متضاد ہوا، اشتعال پسند ممبران نے کہا کہ یہ رسالہ ہماری حکومت کو بدنام کرنے والا ہے مصنف سے باز پرس ہونی چاہئے، صاحب تدبر وفراست اور روشن دماغ ارکان پارلیمنٹ کا تأثر اس کے برعکس تھا انھوں نے رسالہ کی قدر و قیمت کو پہچانا اور مصنف کی طرف سے دفاع کیا کہ یہ رسالہ سراسر حکومت کی خیر خواہی کی نیت سے لکھا گیا ہے اور اس پر ہم کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے لیکن مشتعل ممبران اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور انھوں نے سر سیّد سے باز پرس کی اور سخت باز پرس کی، رسالہ کی مخالفت میں سب سے گرم بیان وزارت خارجہ کے سکریٹری مسٹر سسلی بیڈن کا تھا، انھوں نے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر کے دوران کہا کہ:

> ''اس شخص نے بہت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہئے اور جواب لینا چاہئے اور کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہئے[۱]۔''

اتفاق سے مسٹر سسلی بیڈن ہندوستان آئے، سر سیّد کو اپنی کوٹھی پر بلوا کر بہت ہی گرم لب ولہجہ میں ان سے باز پرس کی اس کا لب ولہجہ اتنا درشت اور سخت تھا کہ سر سیّد کو سوائے صفائی دینے کے اور کوئی راہ فرار نظر نہیں آئی، مسٹر سسلی بیڈن نے کہا کہ اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لئے یہ رسالہ لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ

۱۔ حیات جاوید از حالیؔ ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۹۴۔

کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے، چونکہ سر سیّد انگریزوں کے لئے انتہائی دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ حکومت کے خیر خواہ تھے اس لئے اول روز ہی سے نہایت دانشمندانہ اقدامات کئے تھے اس لئے انھوں نے مسٹر سسلی بیڈن کے جواب میں کہا:

> ''میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے...... میں نے اس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا، صرف ایک کتاب گورنمنٹ کو بھیجی ہے اور اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا[۱]۔''

غلام ہندوستان کا ایک معمولی ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت کا سرکاری ملازم لندن سے آئے ہوئے وزارت خارجہ کے انگریز سکریٹری کے جواب میں اس سے زیادہ فدویانہ صفائی اور کیا دے سکتا تھا، لیکن سر سیّد چونکہ حکومت کی وفاداری میں سچے تھے اس لئے رسیدہ بود بلائے ولے بہ خیر گذشت والی بات ہوئی۔

سر سیّد کی ذہانت

اس تفصیل سے دو باتیں واضح طور پر سمجھ میں آتی ہیں ایک یہ کہ یہ رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' ہندوستان اور یہاں کے عوام کی خیر خواہی اور بھلائی کی نیت سے قطعاً نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا واحد مقصد انگریزوں کی نئی نئی حکومت کے مستقبل میں آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ اگر تم کو ہندوستان میں ایک پائیدار حکومت قائم کرنی ہے تو رسالہ میں درج مشوروں پر عمل کرو، دوسری بات یہ کہ رسالہ بتاتا ہے کہ سر سیّد بہت ذہین بہت بڑے سیاستداں، بہت ہی مدبر اور حکومت وسیادت کا دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، انھوں نے یہ رسالہ لکھ کر انگریزوں کو بتایا کہ تم

۱۔ حیات جاوید از حالیؔ ص ۹۴، ۹۵۔

طاقت کے بل بوتے پر ہندوستان پر قبضہ ضرور کر چکے ہو لیکن اپنے قبضہ کو برقرار رکھنے اور ہندوستان کو غلامی کے شکنجوں میں جکڑے رکھنے کے لئے تدبیریں مجھ سے سیکھو، سرسیّد بادشاہ نہیں تھے لیکن بادشاہ گر ضرور تھے، یہ صرف سرسیّد کا دماغ تھا کہ اس نے انگریزی گورنمنٹ کو ہندوستان میں حکومت کرنے کا ایک ایسا بنیادی گُر بتا دیا کہ انھوں نے اس پر عمل کر کے محدود تعداد میں رہتے ہوئے اتنی کثیر آبادی والے ملک پر نہایت رعب داب اور شان شوکت سے پوری ایک صدی تک حکومت کی، میں اس کی مثال میں بعض مشوروں کی نشاندہی مناسب سمجھتا ہوں۔

ہندوستانیوں کو لڑاؤ اور حکومت کرو

سرسیّد نے اپنے رسالہ میں انگریزوں کو سب سے اہم جو مشورہ دیا وہ یہ تھا کہ ہندو مسلمان میں تفریق پیدا کر دو دونوں کو کبھی ایک محاذ پر جمع مت ہونے دو، دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے آمادۂ پیکار بنائے رکھو، تمہاری حکومت کامیابی سے چلتی رہے گی، اب تک پورے ہندوستان میں چاہے وہ مغلوں کی فوج ہو یا کسی مسلمان نواب یا کسی ہندو راجہ مہاراجہ کی ہر جگہ بلا استثناء ہندو مسلم سپاہیوں کی مشترک فوج رکھی جاتی تھی، ایک ہی دستے میں ہندو سپاہی بھی ہوتے تھے اور مسلمان سپاہی بھی، میرٹھ میں جب بغاوت کا آغاز ہوا، وہاں بھی چھاؤنی میں ہندو اور مسلمان کی ملی جلی فوج تھی جو مغلوں کے زمانہ سے چلی آ رہی تھی، سرسیّد نے انگریزوں کو مشورہ دیا کہ فوج کی یہ ترتیب تم فوراً ختم کر دو، ورنہ تمہاری حکومت کو ہمہ وقت ہندوستان میں خطرہ لاحق رہے گا، دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے الگ کر دو، جب دونوں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گی تو ان میں آپسی اختلافات لازمی ہوگا اس لئے اگر مسلمان بغاوت کرتا ہے تو ہندو اس کی مخالفت کرے گا، اور ہندوؤں میں بغاوت کے آثار اگر ظاہر ہوں گے تو مسلمان اس کی راہ کا روڑا بن جائے گا، اس لئے پہلے ہی دن سے انگریزوں کو ''ڈیوائڈ اینڈ رول'' کو اپنا بنیادی عقیدہ بنا لینا چاہئے، سرسیّد لکھتے ہیں:

''یہ بات سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو جو آپس میں مخالف ہیں نوکر رکھا تھا، مگر یہ سبب مخلوط ہو جانے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ نہ رہا، ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں ان میں یہ سب ایک جا رہنے کے اور لڑی میں مرتب ہونے کے آپس میں اتحاد اور ارتباط برادرانہ ہو جاتا تھا، ایک پلٹن کے سپاہی اپنے آپ کو ایک برادری سمجھتے تھے اور اسی سبب سے ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی، دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں، اس پلٹن کے آدمی جو کچھ کرتے تھے سب اس میں شریک ہو جاتے تھے، ایک دوسرے کا حامی اور مددگار ہو جاتا تھا، اگر انھیں دونوں قوموں کی پلٹنیں اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن نری ہندوؤں کی ہوتی جس میں کوئی مسلمان نہ ہوتا اور ایک پلٹن نری مسلمان کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو یہ آپس میں اتحاد اور برادری نہ ہونے پاتی، اور وہی تفرقہ قائم رہتا، اور میں خیال کرتا ہوں کہ شاید مسلمان پلٹنوں کو کارتوس جدید کاٹنے میں بھی کچھ عذر نہ ہوتا[1]''

انگریزی حکومت پر سرسیّد کا یہ اتنا زبردست احسان ہے کہ جب تک انگریز ہندوستان میں رہے اس کا عملی طور پر اعتراف کرتے رہے، اور تاریخ کے ہر دور میں سرسیّد کے اس سنہرے مشورے پر عمل کرتے رہے، جنگ آزادی کے دوران ہندوستان کے محبوب ترین اور قد آور لیڈروں اور رہنماؤں نے انگریزوں کے طلسم کو توڑنا چاہا اور کبھی کبھی کچھ دیر کے لئے کامیاب بھی ہوئے اور ہندو مسلمان ایک پلیٹ فارم پر انگریزوں کے خلاف جمع ہوئے لیکن حکومت کو سرسیّد کا یہ مشورہ یاد رہا اسی لئے جب خلافت کے زمانہ میں ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے تو انھوں نے سوامی شردھانند کو جو کانگریس کے لیڈر تھے جیل سے رہا کر کے ''شدھی اور سنگھٹن'' کی تحریک چلوا کر اس اتحاد و اتفاق کو ڈائنامیٹ کر دیا، اس طرح انھوں نے اپنی پوری حکمرانی میں سرسیّد کے

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ص ۸۴۳۔

دیئے ہوئے اس سبق کو کبھی فراموش نہیں کیا، عہدِ غلامی کی درازی میں سرسیّد کا زبردست ہاتھ تھا۔

سرسیّد پر حکومت کا اعتماد بڑھتا چلا گیا

انھیں باتوں کی وجہ سے روز بہ روز سرسیّد کی ذات پر انگریزی گورنمنٹ کا اعتماد بڑھتا چلا گیا، سرسیّد کی صداقت و راستبازی، ان کا اخلاص اور ان کے جذبۂ وفاداری نے انگریزوں کے دلوں میں اپنا بلند مقام بنالیا تھا وہ عہدہ کے لحاظ سے منصف تھے جو ڈپٹی کلکٹر کی سطح کا ایک عہدہ ہے جو اس دور میں ہمیشہ انگریز کلکٹر کے ماتحت ہوتا تھا اس کا دائرۂ کار بھی ضلع کے ایک مخصوص حصہ تک رہتا تھا جو ایک تحصیل کے برابر ہوتا ہے لیکن یہ غیر معمولی عہدہ ان کی بلند و بالا شخصیت کے لئے حجاب نہیں بن سکا، ان کی شخصیت کا جوہر جوں جوں نکھرتا گیا انگریزوں کی محفلوں میں ان کا اعزاز بڑھتا چلا گیا، مگر سرسیّد اپنے موجودہ اعزاز و افتخار پر قناعت کرکے نہیں بیٹھ گئے بلکہ ہمہ وقت ایک کے بعد ایک بلند مقام تک پہنچنے کی سعی مسلسل کرتے رہتے تھے، اس کے لئے انھوں نے ہر طرح کی قربانی دینے کا تہیہ کرلیا تھا، چونکہ وہ سرکاری ملازم تھے اس لئے بحیثیت سرکاری ملازم وطن دوستوں کے علی الرغم انگریزی حکومت کے وفادار اور خیرخواہ تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی وفاداری ہر شک وشبہہ سے بالاتر ہوچکی تھی لیکن سرسیّد کی وفاداری اس سے بھی بلند مقام چاہتی تھی، وہ سوچ رہے تھے کہ ایک فرد کی وفاداری پوری مسلمان قوم کی وفاداری کا بدل نہیں ہوسکتی اور جب تک پوری مسلمان قوم پر یہ رنگ نہ چڑھ جائے اس وقت تک ان کا جذبۂ وفاداری پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اور انگریزی حکومت کو ہندوستان میں استحکام حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس مقصد کے لئے سرسیّد نے سفر لندن کا عزم مصمم کرلیا، ایک بیٹے کو اسکالر شپ مل گئی اپنے اور اپنے دوسرے بیٹے اور ایک ذاتی ملازم کے اخراجاتِ سفر کے لئے انھوں نے از خود انتظام کیا اور پورے جاہ و طمطراق کے ساتھ چار افراد کا یہ قافلہ

لندن کے لئے روانہ ہوگیا، اس سفر کا مقصد ایسے اسباب و ذرائع کی تلاش تھی جن سے کام لے کر ہندوستان میں انگریزی حکومت کو استحکام حاصل ہو، سرسیّد خود لکھتے ہیں:

''یہ بات میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے۔ بخوبی استحکام و پائیداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط و ضبط کو ترقی دی جائے۔ بس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نظیر قائم کروں مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ اُمید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے اُن کو مطلع کرکے ان کو فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں ان کو بھی سکھاؤں اور ان کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں[1]۔''

لندن میں سرسیّد کا اعزاز

سرسیّد ہندوستان میں جس عہدہ پر تھے آپ اس سے واقف ہیں، اس ضلع سے اُس ضلع میں ان کا ٹرانسفر اسی طرح ہوتا رہتا تھا، جیسے عام ملازمین کا، کبھی بجنور میں کبھی مرادآباد میں، کبھی غازی پور میں کبھی بنارس میں ان کا عہدۂ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے مساوی تھا اس کے باوجود لندن میں جو ان کا اعزاز و اکرام کیا گیا وہ ہندوستان کی ایک عظیم ترین شخصیت کی حیثیت سے ہوا، لارڈ لارنس جو لندن کی معزز ترین شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے وہ سرسیّد پر سب سے زیادہ مہربان تھے اور مروت سے پیش آتے تھے، اپنے گھر پر ان کو اکثر ڈنر پر بلاتے تھے اور ہر مہینہ میں ایک بار سرسیّد سے ملنے ان کی قیام گاہ پر آتے تھے، انھوں نے لندن کے اکثر اُمراء اور مشاہیر سے سرسیّد کو ملوایا، لارڈ اسٹینلی جو قسطنطنیہ میں حکومت کے سفیر تھے، وہ جب لندن آتے سرسیّد سے ضرور

۱؎ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۴۷، ۱۴۸۔

ملتے تھے، سرجان ولیم کے انڈر سکریٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سرسیّد کو بوجوہ خصوصیت ہوگئی تھی، ملکہ معظمہ کے سمدھی ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے وہ بھی سرسیّد سے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ ملتے رہے اور اپنے بیٹے مارکوئس آف لارن سے بھی جو ملکہ معظمہ کے داماد ہیں، ملایا۔

اس اعزاز واکرام کا راز کیا تھا؟

انگریز جیسی مغرور قوم ایک غلام ملک کے ایک فرد کا یہ اعزاز واکرام کرے، یہ حیرتناک بات تھی، آخر اس کی تہ میں راز کیا تھا؟ بات یہ ہے کہ سرسیّد کے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' کا انگریزی ترجمہ کر کے جب تقسیم کیا گیا تو اولاً بعض جذباتی انگریزوں نے اپنی برہمی کا اظہار کیا لیکن حکومت کے اعلیٰ ارکان نے اس کو قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھا اور جب سنجیدگی کے ساتھ اس رسالہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تو اس کی صحیح قدر ومنزلت کا اندازہ ہوا، سرسیّد نے جتنے مشورے انگریزوں کو دیئے تھے اور جس خلوص سے دیئے تھے وہ ہندوستات میں انگریزی حکومت کے استحکام کے لئے ٹھوس بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے تھے، سرسیّد کی تحریر میں جو بے لچک وفاداری کی روح دوڑ رہی تھی انگریزوں نے اس کو پالیا اس لئے سرسیّد کی قدر ومنزلت میں یک بیک اضافہ ہوگیا اور ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، غلام ہندوستان سے جس کا ذرہ ذرہ انگریزوں کے خون کا پیاسا نظر آرہا تھا اتنا مخلص اتنا وفادار اتنا زیرک اتنا ذہین وفطین انسان ان کو مل جائے گا ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا، جس کو اپنے آقا کی محبت میں مسلمانوں کی حکومت کے تہس نہس ہونے کا ذرا غم نہیں، ہزاروں ہزار مسلمان انگریزوں کی تلوار سے خاک وخون میں تڑپے مگر اس کو کوئی ملال نہیں، اس کے لب حرف شکایت سے آشنا نہیں، وفاداری کا جذبہ اگر اس کے سینے میں موجزن ہے تو وہ صرف انگریزی حکومت کیلئے لندن کے ارباب دانش کے لئے یہ بڑا حیرتناک انکشاف تھا، یہ اعزاز واکرام سرسیّد کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنا تھا جس کے وہ

مستحق تھے، سرسیّد نے ان کو بتایا کہ ایک ایسے ملک میں جو ایک مذہبی ملک ہے، مختلف اور متضاد مذہب اور تہذیب ومعاشرت کے لوگ رہتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد مذہب رکھتے ہیں ایسے ملک میں حکومت کیسے کی جاسکتی ہے؟ انگریزوں نے اب تک صرف اپنی فوجی قوت پر بھروسہ رکھا تھا مصلحت بینی اور دور اندیشی کا فقدان تھا، سرسیّد نے ان کی نگاہوں کے سامنے ایک روشن شاہراہ کھول دی چونکہ ہر مشورہ انھوں نے پورے خلوص پوری دلسوزی اور دل کی گہرائیوں سے مکمل وفاداری کے جذبے سے دیا تھا اس لئے ان میں کہیں جھول نہیں تھا اسی لئے انگریزوں نے سرسیّد کی قدر کی اور ان کو سر اور آنکھوں پر بٹھایا، ہر انسان اپنے محسن کی قدر کرتا ہے، انگریزوں نے اپنے طرزِ عمل سے بتادیا کہ ہم بھی احسان شناس ہیں، احسان فراموش نہیں۔

سرسیّد کی لندن میں ایک تقریر

لندن میں انجینیروں کا ایک شاندار جلسہ ہوا جس میں حکومت کے اہم ذمہ داروں نے شرکت کی تھی سرسیّد کو بھی مدعو کیا گیا تھا، خود لارڈ لارنس نے بہت شاندار لفظوں میں سرسیّد کا تعارف کرایا اور پھر ان سے گذارش کی گئی کہ وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں، سرسیّد بھی اس موقعہ کو ہاتھ سے دینا پسند نہیں کرتے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تقریر پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔

سرسیّد اپنے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں ایک مقام پر انگریزی حکومت کو یہ مشورہ دے چکے تھے کہ ہندوستان میں اگر آپ کو حکومت کرنی ہے تو رعب داب اور شاہانہ جاہ وطمطراق کے ساتھ حکومت کیجئے، ہندوستانیوں کو اپنی رعایا محکوم اور ماتحت تصور کیجئے، اس کے بغیر ہندوستان میں حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی، انھوں نے لکھا تھا:

''اہل ہند کو قدیم عادت تھی کہ اپنے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے، بادشاہ کی شان وشوکت اور تجمل وتحشم دیکھ کر خوش ہوتے تھے، ایک قاعدہ جبلت انسانی میں پڑا ہوا ہے کہ اپنے بادشاہ اور مالک سے مل کر دل خوش ہوتا ہے، یہ بات جاننا

ہے کہ یہ ہمارا بادشاہ اور ہمارا مالک ہے، ہم اس کے تابع اور رعیت ہیں[1]۔“

یہ مشورہ انگریزوں کے لئے بڑا قیمتی مشورہ تھا اور ان کے مغرورانہ مزاج کے عین مطابق تھا رسالہ کے انگریزی ترجمہ کو پڑھ کر لندن کا اونچا طبقہ سرسیّد کے ان جذبات وخیالات سے واقف تھا، اس لئے جب انجینیر وں کے جلسہ میں انھوں نے تقریر کی کہ:

”ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا رعب داب اور دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے ذریعے ہیں مثلاً تعلیم، ہتھیار، اور عدل وانصاف وغیرہ، مگر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے صرف انھیں لوگوں کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہے جن کو ان سے کام پڑا ہے جن کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا ہے لیکن وہ چیز جس نے خاص وعام سب کے دل میں انگلش قوم کی عظمت پیدا کی ہے وہ فن انجینیری کے نتائج ہیں جیسے ریل، بڑے بڑے دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گذرتی ہے، ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے دل میں خود بخود انگریزی سلطنت کا رعب داب اور اس کی بڑائی پیدا ہوتی ہے[2]۔“

تو سرسیّد کی اس تقریر پر اتنی زوروں کی تالیاں بجائی گئیں کہ پورا ہال گونج گیا، کیونکہ خود پسند اور مغرور انسانوں سے کہا جائے کہ ان سے دوسرے لوگ بہت ہی مرعوب ہیں تو اس کو بڑی مسرت ہوتی ہے، سرسیّد نے اسی نفسیاتی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اپنی تقریر کا انداز بیان یہی رکھا۔

جنت کی سیر

سرسیّد جیسے مخلص اور دیانتدار سرکاری ملازم اور عالی دماغ انسان انگریزی حکومت کا سچا خیر خواہ ملکہ معظمہ کا اتنا معتقد ہو کہ اس کے سر پر خدا کا ہاتھ ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ملکہ کی طرف سے شائع کئے جانے والے

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ص ۸۳۸۔

[2] حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۵۳۔

اشتہار کو الہامی کہتا ہو ایسے شخص کی اگر پورے جوش اور ولولے سے پذیرائی ہو اور مسرت وخوشی سے مملو ہو کر اگر ان کو یورپین تہذیب وعریانت کے جاذب نظر اور دلکش مناظر بھی دکھا دیئے جائیں تو اس کا جذبۂ وفاداری اپنے معراج کمال پر پہنچ جائے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے سرسیّد کو مختلف مقامات کی سیر کرائی گئی اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹیوں سے ان کو رُوشناس کرایا گیا، شاندار سے شاندار مناظر دکھائے گئے، سرسیّد ان تفریحات اور دلکش مناظر کے دیکھنے کے بعد سیّد مہدی علی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں، پوچھا کہو لندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا سچ ہے؟ یا نہیں[1]؟“

سرسیّد نے انگریزوں کی زندگی کو اندر باہر سے خوب تفصیل سے دیکھا اور بہت متاثر ہوئے، ڈیڑھ سو سالوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان سے بے پناہ دولت حاصل کی تھی، لندن کے بہت سے لُچے لفنگے، آوارہ گرد نوجوان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم بن کر ہندوستان آئے، انھوں نے یہاں سونے کا بہتا ہوا دریا دیکھا، ہیرے جواہرات کے انبار دیکھے، دونوں ہاتھوں سے خوب سمیٹا، وہ لندن میں لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے، یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے، لفاظی نہیں اظہار واقعہ ہے میں بطور مثال صرف ایک اقتباس ایک انگریز مصنف گرے کی تاریخ ہند سے دے رہا ہوں، وہ لکھتا ہے:

”سرنگا پٹم کے مشہور قلعہ کو فتح کرنے کے بعد کمپنی نے فیصلہ کیا کہ جواہرات، روپیہ، سامان کو موقع ہی پر تقسیم کر لیا جائے، جس افسر نے جس قدر خدمت کی ہے اس کے لحاظ اور اندازہ لگا کر اسے مال غنیمت سے حصہ دیدیا جائے، اس تقسیم کے لئے ایجنٹ مقرر کر دیئے گئے میجر پرائس لکھتا ہے کہ میں بھی اسی میں تھا، قلعہ کی دولت دیکھ کر آنکھیں پھر گئیں، دیکھا نہیں جاتا تھا کہ نا قابل یقین دولت اور لاتعداد زرو جواہر قلعہ میں کہاں سے آ گئے، مختلف قسم کے پارچہ جات

[1] حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۵۷۔

اور طرح طرح کی قیمتی اور نادر اشیاء اور لاجواب ذخیرے سامنے کھلے پڑے تھے، ہماری عقل حیران تھی، فرد حساب بھی تیار نہ کر سکتے تھے، معلوم ہوا کہ بیرونی دروازوں سے سپاہی اور توپ خانوں کے لوگ گھس آئے تھے اور کافی مال لے کر چمپت ہو گئے تھے، شہر میں بھی ہر شخص نے خوب لوٹ مار کی بیسیوں گھروں میں جاکر روپیہ چھین لیا گیا، ڈاکٹر مٹن کے پاس ۷۴ نمبر کی رجمنٹ کے ایک سپاہی نے نہایت معمولی رقم میں پردہ اور کپڑے بیچے جن میں اس قدر قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے کہ ان کی مجموعی قیمت کا اندازہ ایک ہندوستانی جوہری نے چالیس ہزار پونڈ لگایا تھا، بعض اور زیوروں کی قیمت کا اندازہ لگانے سے جوہری بھی قاصر تھے، اس سپاہی نے یہ کپڑے ایک گھر سے چرائے تھے اور اپنی رجمنٹ کے ڈاکٹر کے ہاتھ نہایت معمولی رقم پر فروخت کر دیئے تھے، تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ تمام جواہرات اور زیورات کو میز پر پھیلا دیا گیا اور ڈھیریاں بنادی گئی تھیں، پھر ہر ڈھیری کی قیمت ایک جوہری کے ذریعہ سے تخمینہ کرائی گئی، جس کے بعد یہ چیزیں افسروں کو تقسیم کر دی گئیں، سوائے لارڈ ہیرس کے جو کمانڈر انچیف تھا باقی سب افسر میزوں کے گرد بیتابی کے ساتھ جمع ہو گئے، لارڈ صاحب اپنی بڑی پوزیشن کی وجہ سے نہیں آئے مگر انھیں ان کا حصہ خیمہ میں بھیج دیا گیا، لارڈ ہیرس کے ڈھیر میں وہ ہار بھی تھا جس کی قیمت ۱۳۵۰۰ پونڈ بتائی جاتی ہے، یہ ہار ایک مندر کی مورتی کے پیٹ سے نکلا تھا، سر ڈیوڈ بیرڈ کو اس کے حصہ میں ایک انگشتری ملی جس کی قیمت پچاس ہزار تھی، مگر اس نے اس وقت غصہ میں آکر اسے پھینک دیا تھا کہ یہ تو رنگا ہوا شیشہ ہے ایک سپاہی نے اٹھاکر پانچ ہزار میں فروخت کر دی، میجروں کو جواہرات تقسیم کرنے کے بعد باقی جواہرات اور قیمتی اشیاء دیگر افسروں اور سپاہیوں میں تقسیم کر دی گئیں ٹیپو سلطان نے ایک تخت بے مثل ساخت کا بنوایا تھا جو خالص سونے اور جواہرات کی بنی ہوئی تھی تخت چار سونے کے شیروں کی

پشت پر قائم تھا اس تخت کے ٹکڑے کر کے ڈھیر لگا دیئے گئے ۱۸۰۰ پونڈ ہر شخص کے حصہ میں آئے تخت کی چھت جنرل گانٹ کے ہاتھ ۲۵۰۰ پونڈ میں فروخت کر دیا گیا، اس تخت کے سامنے دو شیر ٹھوس اور خالص سونے کے تھے بادشاہ کو ولایت بھیج دیئے گئے، اس کے ساتھ کچھ اور ہیرے جواہرات اور قیمتی ہتھیار بھی روانہ کر دیئے گئے، یہ تو افسروں اور حاکموں کو ملا، ہر سپاہی کو جسے پرائیویٹ کہا جاتا ہے تقریباً چھ چھ پونڈ ضرور مل گئے لیکن انھوں نے پرائیویٹ طور پر کافی روپیہ پیدا کر لیا تھا، کیونکہ میجر پرائس لکھتا ہے کہ بہت سے یورپین سپاہیوں نے کئی کئی ہزار کے جواہرات بھیجے اور پھر اپنی نوکری چھوڑ کر اپنے گھروں کو چلے گئے، بعض سپاہیوں کے متعلق معلوم ہوا کہ انھوں نے ایک شراب کی بوتل کے لئے کئی کئی سو روپے کی مالیت کے جواہرات کوڑیوں کے دام بیچ ڈالے ان تفصیلات سے جو سرکاری کاغذات کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں سمجھا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصص مثلاً بنگال کے محلات، اودھ کے شاہی خاندانوں، دہلی کے بادشاہ اور پنجاب کے علاقوں، اور سندھ کے امیروں، راجپوتانہ کی ریاستوں اور دیسی راجدھانیوں سے انگریزی افسروں، فوجی حاکموں، گماشتوں، کارندوں اور حتی کہ معمولی سپاہیوں نے جائز اور ناجائز طریقہ سے کس قدر روپیہ اینٹھا ہوگا۔"[1] (تاریخ ہندازگرے)

ہمارے آباء واجداد کی دولت لوٹ کر جب وہ ہندوستان سے لندن پہنچے تو وہ وہاں شاہانہ زندگی بسر کرنے لگے، عیش وعشرت اور رئیسانہ تکلفات سے آراستہ وپیراستہ ان کا معاشرہ بن گیا جو آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا، سرسیّد نے ان مناظر کو دیکھا تو ان کی آنکھوں سے دردوغم کے بجائے ان کی آنکھوں میں رشک کی بجلیاں تیرنے لگیں۔

یورپ میں زندگی ہمیشہ اخلاقی بندشوں سے آزاد رہی اور جب ان کے یہاں دولت کی فراوانی ہوئی تو وہ خوب کھل کھیلے حسن وجمال قدرتی تھا، پُرتکلف لباسوں نے

[1] تاریخ سلطنت خداداد (میسور) از محمود خاں بنگلوری شائع کردہ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۱۹۴۷ء ص ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳۔

حسینانِ فرنگ کو اور چمکا دیا، عیش وعشرت کے پر تکلف سامان اور پاکیزہ تر اسباب معاشرت چمکتے چمچماتے فرنیچر اور لہکتے مہکتے در و بام، اور دعوت نظارہ دیتی ہوئی یورپین ہرنیاں اور تتلیاں، ان تمام رعنائیوں اور شادابیوں نے لندن کو دنیاوی جنت بنا رکھا تھا، سرسیّد ان مناظر کو دیکھ کر حواس باختہ ہوگئے، اور جذبات کی رو میں بہ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو نصیحت کرنے لگے کہ وہ یورپین تہذیب وتمدن اور طرز معاشرت اختیار کریں، تعصب اور دقیانوسیت اپنی زندگی سے باہر نکال کر باہر پھینک دیں، جنت و دوزخ کے فرضی تصورات کو ذہنوں سے جھٹک کر نکال دیں تو دنیا ان کے لئے خود جنت بن سکتی ہے زندگی کا سلیقہ انگریزوں سے سیکھیں، انگریزی حکومت کو السلطان ظل اللہ فی الارض کی نگاہ سے دیکھیں، ان سے نفرت وعداوت، بغض وعناد، دشمنی وبغاوت کرکے نمک حرامی نہ کریں اور ایک وفادار رعایا اور خیر خواہ دولت انگلیشیہ بن کر رہیں اسی میں ان کی بھلائی ہے، اس طرح کی نصیحتوں سے مملو بیانات وہ لندن سے لکھ کر ہندوستانی اخباروں میں اشاعت کے لئے بھیجتے تھے اور وہ یہاں سے شائع ہوتے تھے جس کی وجہ سے پورے ملک میں سرسیّد کے خلاف غم وغصہ اور اشتعال کی فضا بن گئی، جب ان کے ہم مشرب ہم نواؤں نے ان کو ہندوستان کے حالات اور فضا سے مطلع کیا تو ان کو جوش اور جذبات کی رو یک بیک تھم گئی، انھوں نے محسوس کیا کہ ان سے چوک ہوگئی، ظاہر وباطن کی یکسانیت مستقبل کی راہوں میں سنگ گراں بن جائے گی، اس لئے اندرونی جذبات کو اپنے حدود میں رہنا چاہئے اور ظاہر کا دائرہ کار دوسرا ہونا چاہئے، انھوں نے ۲۲/مارچ ۱۸۷۰ء کو ایک تحریر بہ عنوان ''غدار از طرف گنہگار سیّد احمد خاں'' ہندوستان بھیجی اور پھر ایک مضمون بعنوان ''عرضداشت سیّد احمد بخدمت اہل وطن'' اخباروں میں اشاعت کے لئے روانہ کی[۱]''

نئے جذبات اور نئی اُمنگیں

انگریزی حکومت کے ایک وفادار ملازم ہونے کی حیثیت سے اپنی حکومت کی

[۱] حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۵۷۔

خواہی سرسیّد کا فرض منصبی تھا جس کو وہ نہایت عزم واستقلال سے انتہائی کٹھن اور مشکل حالات میں بھی ادا کرتے رہے، اسی وجہ سے پوری انگریزی حکومت ان کے خلوص اور دیانتداری کی معترف ہوگئی اور ان کے احسانات کے بوجھ سے ہمیشہ زیر بار رہی، لندن میں ان کی پذیرائی اور اعزاز واحترام نے ان کے جذبہ وفاداری کو آتش سیال بنا دیا اور وہ لندن ہی میں بیٹھ کر ہندوستان میں اپنے مشن کو چلانے کا ذہنی خاکہ تیار کرنے لگے تھے، لندن جانے کے بعد ان کو ہر طرح کی سہولتوں کے دراز کھلتے ہوئے نظر آنے لگے تھے، انگریزوں نے بھی اپنی غلطی کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا دشمن نمبر ایک تصور کرتے تھے سرسیّد کو اندر باہر سے پرکھنے کے بعد ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی جیسا کہ سرسیّد کے لندن سے رخصت ہونے کے وقت ایک اخبار نے لکھا تھا:

> ''جن انگریزوں سے یہاں ان کی ملاقات ہوئی ان پر ان کی عام لیاقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصیتوں نے ان سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی ان سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا تھا، بہت عمدہ اثر ہوا، یہاں کے بہت سے مدبران سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایسے لئیق اور واقفکار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سیّد احمد خاں میں نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی رہتی[۱]''

انگریز سرسیّد کی کن باتوں سے متأثر ہوئے؟ اور اپنے کام کے لئے ان کو موزوں ترین آدمی سمجھا؟ ہندوستان کے بارے میں ان سے کیا خصوصی گفتگو ہوئی کہ ہر ایک ان کی لیاقت کا قائل ہوگیا؟ وہ وہی بات تھی جو بلا استثناء ہر انگریز کے دل میں پیوست تھی کہ ہندوستان میں ہمارے کام کا کوئی آدمی نہیں، بالخصوص مسلمانوں میں ایسا کوئی شخص نہیں جو صحیح معنی میں خلوص دل سے برطانوی حکومت کا وفادار اور خیر خواہ ہو وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ پوری مسلمان قوم اپنا اقتدار چھن جانے کی وجہ سے تلملائی

[۱] حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۶۰۔

ہوئی ہے، ان کے دلوں میں انگریز دشمنی کا لاوا پک رہا ہے، لیکن سرسیّد سے مل کر ان کی غلط فہمی دور ہوئی، اور پھر سرسیّد جیسا عالی دماغ انسان جو ایک حکومت کا دماغ رکھتا ہے، ہندوستان میں ایک پائیدار حکومت قائم کی جا سکتی ہے، اتنے بڑے ملک کو کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے ہندوستان کی دو بڑی اور پر جوش قومیں مسلمان اور ہندوؤں کو کس طرح ایک دوسرے سے لڑا کر انگریزی حکومت کو بچایا جا سکتا ہے یہ سب کچھ ان کو سرسیّد سے سیکھنا پڑا، اور انھیں خطوط پر بعد میں انگریزوں نے اپنی حکومت کو ایک صدی تک چلایا اور کامیاب ہوئے، انھیں احسانات کے اعتراف کے طور پر ملکہ وکٹوریہ کی بارگاہ خاص میں شرف باریابی حاصل ہوا، اور ان کے سمدھی اور داماد کے ہاتھوں سے ان کو تمغہ اور خطاب[1] دیا گیا۔

سرسیّد کی لندن سے واپسی

ایک سال پانچ ماہ لندن میں رہ کر جب ستمبر ۱۸۷۰ء میں سرسیّد ہندوستان تشریف لائے تو ان کے سینہ پر ایک چمکتا ہوا ستارہ اعزاز وافتخار کی آب وتاب سے آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا اور ان کے سر پر جواد الدولہ عارف جنگ آنریبل ڈاکٹر سرسیّد احمد خان صاحب بہادر کے، سی، ایس، آئی، ایل، ڈی، ایف، آر، ایس کا سنہرا تاج جگمگ جگمگ کر رہا تھا، یہ چمکتا ہوا ستارہ، یہ جگمگاتا ہوا تاج سرسیّد جیسے عالی دماغ شخص پر انگریزی حکومت کا کوئی احسان نہیں تھا، سرسیّد کا حق تھا جو ان کو ملا، کیونکہ جب پورے ہندوستان میں انگریزوں کا کوئی دوست نہیں تھا وہ اپنے ہم وطن، ہم مذہب مجاہدین آزادی کی صفوں سے نکل کر ان انگریزوں کی صفوں میں شامل ہو گئے جو ان کے آباء واجداد کی آٹھ سو سالہ حکومت کو تہس نہس کر رہے تھے، وہ اپنے وطن اور اپنے ہم مذہب دونوں کی نگاہوں میں معتوب ہوئے لیکن انھوں نے انگریزوں کی رفاقت، ان کی مکمل اور ناقابل شکست اطاعت انقیاد اور بے لچک وفاداری کو ترک نہیں کیا، ان

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے حیات جاوید از حالی ص ۱۵۳، ۱۵۴۔

کی خدمات لارڈ کلایو لارڈ ولزلی، لارڈ لارنس، جنرل ولسن، جنرل مارس اور جنرل ہڈسن کی خدمات سے کسی طرح کم نہ تھیں، انھوں نے حکومت کے دائرہ کو تلوار کی طاقت سے وسیع کیا اور سرسیّد نے اپنی حکمت عملی سے انگریزی حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں کلیدی رول ادا کیا، انھوں نے ہندوستانیوں کے دل ودماغ سے آزادی کے تصور کو بھی نکال دیا اور بھرپور کوشش کی کہ ہندوستانیوں کے دل ودماغ پر بغاوت وانقلاب کی پرچھائیں بھی نہ پڑیں، سرسیّد کا یہ کارنامہ انگریز فاتحین کے کارناموں سے کہیں بڑھا ہوا ہے ہندوستان میں برطانوی حکومت نے جو ایک صدی پوری کی وہ انگریز جنرلوں اور کرنلوں کی شمشیر زنی کی وجہ سے نہیں سرسیّد کے صائب وصحیح مشوروں پر عمل کر کے یہ کامیابی حاصل کی، اس لئے یہ تمغہ اور خطاب سرسیّد پر کوئی احسان نہیں تھا بلکہ سرسیّد کے احسانات سے خود انگریزی حکومت کی گردن جھکی ہوئی تھی، سرسیّد اگرچہ رنگ، نسل اور خاندان کے لحاظ سے انگریز نہیں تھے لیکن دل ودماغ، ذہن وفکر اور جذبات وخیالات کے لحاظ سے انگریزی قوم کے ایک عظیم ترین فرد تھے۔

مسلمانوں کو درس وفاداری

''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' کی اشاعت اور سفر انگلستان میں حکومت کی طرف سے اعزاز واکرام اور تمغہ خطاب پانے کے بعد سرسیّد کی ذات انگریزی حکومت کے وفاداروں کے لئے منارۂ نور بن گئی۔ اب ہندوستان میں ان کی ہر جد وجہد اور سرگرمیاں حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے داروں کی نگاہ میں ہر شک وشبہہ سے بالاتر ہو گئیں اور اب ان پر کسی کو انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں رہ گئی، اس لئے لندن میں بیٹھ کر ہندوستان میں انگریزی اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے جو تجاویز سوچی تھیں اور جو خاکہ بنایا تھا ہندوستان واپسی کے بعد اس پر پوری سرگرمی سے عمل شروع کر دیا، چونکہ سرسیّد انتہائی ذہین وفطین ہونے کے ساتھ ساتھ آہنی عزم وارادہ کے بھی مالک تھے مشکلات کے وقت گھبرا جانا انھوں نے کبھی جانا ہی نہیں، ہر

طرح کی مخالفتوں کے طوفان میں مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں لگے رہنا اور پائے اثبات میں جنبش نہ ہونا ان کی فطرت تھی، اس لئے وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنے مشن میں لگ گئے۔

سرسیّد پر کامل اعتماد کی ایک مثال

سرسیّد پر انگریزی حکومت کس درجہ اعتماد کرتی تھی اور اس کو کتنا بھروسہ تھا اس کی ایک مثال حالی نے اپنی مشہور کتاب میں پیش کی ہے، آپ یہ داستان انھیں کے لفظوں میں سنئے، وہ لکھتے ہیں:

''جن دنوں بنگال میں وہابیوں کی تحقیقات اور تلاش ہو رہی تھی ایک یورپین معزز افسر سے جو اسی کام پر مامور تھا ریل میں سرسیّد سے ملاقات ہوگئی، دونوں آگرہ جا رہے تھے اور سرسیّد کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ افسر وہابیوں کی تلاش پر مامور رہا ہے، اس افسر نے اُن سے پوچھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ انھوں نے کہا ''وہابی مسلمان ہوں'' پھر اس نے سرسیّد کا سارا پتہ دریافت کیا انھوں نے صحیح صحیح بیان کر دیا، جب ریل آگرہ پہنچی دونوں اتر کر اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے، پھر سرسیّد مٹن صاحب کمشنر آگرہ سے ملنے کو گئے، اتفاق سے وہ افسر انھیں کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، اور ان سے ذکر کر چکا تھا کہ اس حلیہ اور اس نام کا ایک وہابی مسلمان فلاں جگہ ٹھہرا ہوا ہے، اب کمشنر صاحب نے افسر مذکور کو بلا کر کہا کہ ''لو یہ تمہاری اسامی حاضر ہے'' جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ شخص باوجود وہابی ہونے کے بڑا خیر خواہ سرکار ہے تو اسے تعجب ہوا اور سب بڑی دیر تک اس بات پر ہنستے رہے[1]''

شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ ۱۸۶۴ء تک وہابی ہونا اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کی سزا پھانسی اور کالے پانی سے کم نہیں تھی مذکورہ سالوں میں انگریزی حکومت نے مجاہدین

۱؎ حاشیہ از حالی حیات جاوید ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۷۶۔

آزادی پر جو سازش و بغاوت کے تین بڑے مقدمات چلائے ہیں ان کو تاریخ میں ''انبالہ سازش کیس'' یا ''مقدمہ وہابیان'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان مقدمات میں ہندوستان کے جلیل القدر علماء ومشائخ اور مسلمان امراء ورؤسا ماخوذ تھے اور بلا استثناء ان تینوں مقدمات میں تمام ملزموں کو پھانسی کا حکم سنایا گیا پھر کچھ دنوں جیلوں میں رکھ کر پھانسی کے بجائے ان کو کالے پانی بھیج دیا گیا پھر ان کو وطن کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی[1]''

وہابی ہونا اتنا بڑا جرم تھا کہ اگر حکومت کو شبہہ بھی ہوگیا کہ فلاں شخص نے وہابی مسلمانوں کی مدد کی ہے تو سزا سے نہیں بچ سکتا تھا، چنانچہ تیسرے ''مقدمہ وہابیان'' جو عظیم آباد میں ۱۸۷۰ء میں چلا گیا اس میں حشمت داد خاں اور امیر خان کو صرف اس لئے مجرم قرار دیدیا گیا کہ ان کے یہاں سے وہابی مجاہدین کی ایک ہُنڈی برآمد ہوگئی تھی، یہ کلکتہ کے رؤساء میں شمار ہوتے تھے چمڑے کا بہت بڑا کاروبار تھا، محض اسی جرم پر جھوٹے گواہوں سے گواہیاں دلوا کر امر خاں کو کالے پانی بھیج دیا گیا اور ان کی کروڑوں کی جائداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی، حشمت داد خاں کو دس سال مختلف جیلوں میں رکھنے کے بعد اس حال میں چھوڑا گیا کہ یہ کروڑ پتی آدمی دانے دانے کو محتاج ہو چکا تھا اور اسی غم میں مر گیا۔

وہابی ہونا اس دور میں بغاوت کے جرم سے بھی بڑا جرم مانا جاتا تھا چاہے یہ الزام کتنی ہی بڑی شخصیت پر لگایا جائے بلا ثبوت اس کو پھانسی پر چڑھا دینا انگریزوں کے لیے ضروری تھا۔ سرسیّد سے کہیں بڑی اور عظیم شخصیتیں صرف اس جرم میں ماخوذ ہوئیں، عظیم آباد کے بہت ہی معزز ومحترم صاحب علم وفضل رئیس کبیر بڑے جاگیر دار مولانا احمد اللہ ان کے بھائی مولانا یحییٰ علی جیسے لوگ وہابی ہونے کے الزام میں گرفتار کئے گئے اور بغاوت وسازش کا ان پر فرضی مقدمہ چلا کر ضمیر فروش اہلکاروں سے گواہیاں دلوا کر فرد جرم عائد کر دی گئی، انگریز جج نے پھانسی کا حکم سنا دیا اور کروڑوں کی

۱؎ تفصیل کے لئے دیکھئے ''تحریک آزادی اور مسلمان'' ناشر دار المؤلفین دیوبند۔

جائداد کو بحق سرکار ضبط کرلیا گیا اور عید کے دن ان کو اور ان کے بال بچوں اور پردہ نشین خواتین کو ان کے گھروں سے اس حال میں نکالا گیا کہ گھر سے ایک سوئی بھی لے جانے نہیں دیا گیا اور اس معزز خاندان کو سڑک پر اس طرح چھوڑا گیا کہ صرف ان کے بدن پر جو کپڑے تھے وہی ان کی ساری کائنات تھی اور ان دونوں بزرگوں کو پہلے پھانسی کی سزا سنائی گئی کچھ دنوں جیل میں رکھنے کے بعد پھانسی کی سزا کو بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا گیا اور ان کو ۱۵ر جون ۱۸۶۵ء کو کالے پانی بھیج دیا گیا[1]۔

منصوبہ بند پروگرام

لندن سے واپسی کے بعد سرسیّد کے سامنے دو پروگرام تھے، پہلا پروگرام مسلمانوں میں جدید تعلیم اور جدید تہذیب کو مقبول عام بنانا تھا ان کے خیال میں اس سے دو فائدے تھے، ایک تو میڈل کلاس کے مسلمانوں کے لئے باعزت ذریعہ معاش پیدا ہوجائے گا کیونکہ ہندوستان میں سب سے زیادہ معاشی اعتبار سے وہی پریشان حال تھے نوابوں اور راجاؤں کو تو حکومت نے رام کرلیا تھا، کچھ ریاستوں کے حکمران خاندان کے وظیفے مقرر کردیئے تھے اور کچھ ریاستوں کو ''سب سڈیری سسٹم'' کے اصول پر حکمراں خاندان کو موج مستی کرنے کی سہولتیں دیدی تھیں، اپنی فوج ان ریاستوں میں رکھ کر یا ریزیڈنٹ مقرر کرکے ان نوابوں اور راجاؤں کی شہ رگ کو شکنجہ میں کس لیا تھا مگر وہ اپنی ریاست میں عیش و آرام کی زندگی گذار رہے تھے، رہ گئے عوام تو سرسیّد کو اُن سے نہ کوئی واسطہ تھا اور نہ ان سے کوئی ہمدری اور نہ کبھی عام مسلمانوں کے مسائل سے ان کو کوئی دلچسپی رہی، صرف میڈل کلاس مسلمانوں کا طبقہ ایسا تھا جو ہمیشہ سے ملازمت پیشہ رہا ہے، مغلیہ حکومت کے دور میں تمام دفاتر پر وہ چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے سماج میں عزت بھی تھی اور زندگی بھی خوش خرم گذر رہی تھی، مغلیہ حکومت کے خاتمہ اور انقلاب زمانہ نے ان کے ہاتھوں سے یہ ذریعہ معاش چھین لیا، نئی حکومت کے دفاتر میں اُردو فارسی کا چلن ختم ہونے سے وہ بے سہارا ہوگئے اس

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے ''تحریک آزادی اور مسلمان'' ص ۴۴ تا ۵۳، شائع کردہ دارالمولفین دیوبند مولفہ اسیر ادروی۔

لئے اس طبقہ کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی، اب انگریزی کا رواج تھا بغیر اس کے ملازمت ممکن نہ تھی اس لئے ان کی تعلیم کا بندوبست کرنا سرسیّد نے ضروری سمجھا۔

دوسرا فائدہ یہ تھا کہ یہ طبقہ انگریزی تعلیم حاصل کرکے حکومت کا قابل اعتماد اور وفادار عنصر بن جائے گا، اس طرح کی جماعت ہندوستان میں بنانا انگریزی حکومت کے مقاصد میں شامل تھا، بہت پہلے لارڈ میکالے نے ۷ر مارچ ۱۸۳۵ء کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی زبان میں تعلیم دیئے جانے کی حمایت کی تھی اور اپنی رپورٹ میں اپنی اس رائے کی وجہ یہ بیان کی تھی:

''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق، اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو[1]''

سرسیّد کا مقصد ایسی ہی جماعت کی تشکیل تھی، کیونکہ یہ جماعت انگریزی حکومت کا دست و باز و بن کر اس کو مدد پہنچائے گی اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کو استحکام حاصل ہوگا، لیکن سرسیّد نے اس شراب کو دو آتشہ بنانے کے لئے انگریزی تعلیم کے ساتھ یورپین تہذیب بھی اختیار کرنے پر ضرورت سے زیادہ زور دینا ضروری سمجھا، اس کے لئے اپنے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں یورپین اساتذہ کا اسٹاف لازمی قرار دیا، ان کو ہندوستانی اساتذہ کے مقابلہ میں لمبی لمبی تنخواہیں دیتے، ان کے رہن سہن کے معیار کو شاہانہ رکھنے کی کوشش کرتے، ان کے مقابلہ میں ہندوستانی اساتذہ کو وہ سہولتیں اور تنخواہیں نہیں دیتے تھے، ان کی نگاہ میں شاید ایسا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ حاکم اور محکوم کا فرق نمایاں رہے، مدرسۃ العلوم کے ہر طالب علم کے ذہن میں یہ احساس باقی رہے کہ وہ محکوم قوم کا فرد ہے، اس طرح وہ انگریزی اساتذہ کی معاشرت، تہذیب اور سوسائٹی سے زیادہ متاثر ہوگا، کیونکہ ہر انسان اپنے سے اُوپر والے کے طور طریق کو اختیار کرکے اس کی صف میں شامل ہونے کو ذریعہ فخر سمجھتا ہے، سرسیّد کے سامنے

[1] تاریخ التعلیم از میجر باسو، بحوالہ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' از طفیل احمد منگلوری ص ۱۳۷۔

انگریزی تعلیم سے یہی مقصد تھا، اور وہ اس کے لئے پورے طور پر کوشش کرتے رہے۔

ان کا دوسرا پروگرام ہندوستان کے عام مسلمانوں سے مذہب کی گرفت کو ڈھیلا کرنا تھا وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان علماء و مشائخ کے اثر و اقتدار سے گلو خلاصی حاصل کرلیں اور جب مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی تو آسانی کے ساتھ ان باتوں کو قبول کرلیں گے جن کی سر سیّد تبلیغ کرتے تھے۔

پہلے پروگرام کے تحت علی گڈھ میں مدرسۃ العلوم کھولا، اور دوسرے پروگرام کی تکمیل کے لئے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرنے کا پروگرام بنایا، انھیں دونوں مقاصد کو لے کر سر سیّد ہندوستان میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑتے رہے، لکچر دیتے رہے، مضامین لکھتے رہے اور کچھ روٴسا اور اُمراء کو اپنا ہم نوا بنا کر اس مشن کو پوری قوت سے ۱۸ سال تک مسلسل چلاتے رہے، اور حکومت کو اپنی سرگرمیوں سے ہمیشہ باخبر رکھتے رہے، اگر ہندوستان میں دھیمی سی بھی کوئی آواز سنائی دیتی جس سے انگریزی حکومت کی مخالفت کی جھلک ملتی، اس کے خلاف پورا یک محاذ کھڑا کردیتے، چنانچہ جب انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کو تین چار برس ہوگئے اور اس میں کچھ ترقی پسند افراد شامل ہوگئے تو حکومت سے بعض مسائل میں مطالبات کی تجویزیں بھی پاس ہونے لگیں اس سے سر سیّد نے یہ سمجھا کہ اب ہوا کا رخ بدل رہا ہے اور حکومت پر دباؤ ڈال کر اپنے مطالبات منوانے کی جانب پیش قدمی ہو رہی ہے، سر سیّد جیسے مخلص وفادار کو یہ کیسے برداشت ہو سکتا تھا، انھوں نے کانگریس کے خلاف دھواں دھار تقریریں مختلف مرکزی مقامات میں کیں اور کانگریس کی سرگرمیوں کو بریک لگانے کے لئے ایک انجمن بنا ڈالی۔

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

اگست ۱۸۸۸ء میں سر سیّد نے ''پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' اس غرض سے قائم کی

کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقدار کانگریس میں شریک نہیں ہیں ان کی رائیں، خیالات اور خط و کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے ولایت کو بھیجی جائیں اور نیز اخبارات کے ذریعہ ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کی جائیں۔

سر سیّد کا جذبہ وفاداری اس کو برداشت نہیں کر رہا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنی مشکلات و مصائب کے حل کے لئے کوئی تجویز پاس کریں یا حکومت سے کوئی مطالبہ کریں وہ ہندوستان کو غلامی کی دلدل سے اُبھرتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، اور جو لوگ اس روش کو اختیار کرکے یہاں کے قومی مسائل کو حل کرنے کا جذبہ رکھتے تھے ان کی سرگرمیوں سے اپنی حکومت کو باخبر رکھنا ضروری سمجھتے تھے تاکہ بروقت ان طاقتوں کو کچلنے اور تہس نہس کرنے کے لئے حکومت تیار رہے جب کہ خود کانگریس میں ابھی ایسے ترقی پسند داخل نہیں ہوسکتے تھے جو اس جرأت رندانہ کا اظہار کرتے، لیکن سر سیّد جیسا دور اندیش انسان ہوا کا رخ پہچان گیا کہ آج جس جماعت کی آواز دبی دبی سی ہے کل اس کی آواز میں رعد و برق کی کڑک بھی پیدا ہو سکتی ہے جو ایوان حکومت میں زلزلہ ڈال سکتی ہے اس لئے پیش بندی کے طور پر اس انجمن کے ذریعہ اس کی راہ میں ایک سنگ گراں حائل کردیا اور کانگریس کی مخالفت کو اپنا مشن بنا لیا۔

سر سیّد بات کے دھنی تھے اور عملی آدمی تھے جس بات کو وہ صحیح سمجھتے تھے اس کو بروئے کار لانے میں پوری جدوجہد کو کام میں لاتے تھے اس لئے جب کانگریس کی مخالفت شروع کی تو کئی سو کی تعداد میں جاگیرداروں کو ایک پلیٹ فارم پر کانگریس کی مخالفت میں کھڑا کردیا اور بالخصوص مسلمانوں میں زبردست پروپیگنڈہ کے ذریعہ کانگریس سے نفرت پیدا کرنے کا کام بھی پوری سرگرمی سے شروع کردیا اور اس کے بہترین نتائج بھی سامنے آگئے، خواجہ الطاف حسین حالیؔ ہمیں بتاتے ہیں:

''پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' کے قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی ممالک متوسط، اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی

انجمنوں میں کانگریس کے برخلاف جلسے کئے گئے، تمام تعلقہ داران اودھ، مہاراجہ بنارس ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں[1]۔"

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا ۞ اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

آج آزاد ہندوستان میں سرسیّد کی ان سرگرمیوں کی روداد پڑھی جاتی ہے اور ان کی وطن دشمنی اور مسلمانوں کے مستقبل کو تباہ کرنے اور ان کو ہندوستان کی سرزمین میں ہمیشہ کے لئے ذلیل ورسوا کرنے کی جدوجہد پر نظر جاتی ہے تو دل غم وغصہ سے کھول جاتا ہے، آج تاریخ کی ان سچائیوں کو پڑھ کر ہماری گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں، دل چاہتا ہے کہ کاش کوئی تاریخ صفحات سے ان حقائق کو کھرچ کر پھینک دے ہمارے دامن پر لگے ہوئے اس گھناؤنے داغ کو کوئی دھودے، لیکن مسلمانوں کے مسیحا نے ساری زندگی انگریزوں کی وفاداری کے سوا کوئی کام ہی نہیں کیا تو اس کی پردہ پوشی کے لئے نہ الفاظ کی جادوگری کام آسکتی ہے اور نہ زور بیان اور طاقت لسانی کی چادر سے اس کو چھپایا جاسکتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ مسلم یونیورسٹی ان کی وفات کے چوتھائی صدی بعد قائم ہوئی اور ان کے جذبات وخیالات کی سمیّت سے ایک حد تک محفوظ رہی ورنہ شاید ۱۹۴۲ء کی پرشور تحریک ۱۹۴۷ء کے بعد ہونے والی آگ اور خون کی بارش میں اس کا وجود مٹ گیا ہوتا اور اس کے نام ونشان کو صفحۂ ہستی سے کھرچ کر پھینک دیا ہوتا اور ہم اپنے ایک عظیم قومی سرمایہ سے محروم ہوجاتے۔

سرسیّد کی ساری سرگرمیوں کے پس پشت جو جذبہ کام کررہا تھا، اختصار کے ساتھ میں نے اس کی نشاندہی کردی، میری اس تفصیل سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ سرسیّد کا واحد مقصد ہندوستان میں انگریزی حکومت کو طاقت وقوت پہنچانا اور اس کے استحکام کے لئے جدجہد کرنا تھا، نہ ان کے سامنے ہندوستان کے مفاد تھے، نہ

۱؎ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۲۵۸، ۲۵۹۔

مسلمانوں کے نہ اسلام کے، ان کو صرف انگریزی حکومت کا مفاد عزیز تھا اس مفاد کے لئے وہ اپنے ملک اپنی قوم اور اپنے مذہب سب کو قربان کرسکتے تھے، وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دست وبازو بن کر رہے، بلکہ جو ہاتھ ہندوستانی عوام کو غلامی کے سخت ترین شکنجوں میں کس رہے تھے انھیں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ سرسیّد کا بھی تھا، وہ ہندوستان کے دماغ سے نہیں انگلستان کے دماغ سے سوچتے تھے وہ شکل وصورت، جسم، لباس اور ہیئت کے لحاظ سے ضرور ہندوستانی تھے لیکن غور وفکر، سمجھ، بوجھ، ذہن ومزاج اور دل ودماغ کے لحاظ سے خالص انگریز اور اس کے سوا کچھ نہیں، وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے غیرت وخودداری کو حماقت سمجھتے تھے، وہ ایک غلام اور وفادار نوکر کے دماغ سے سوچتے تھے، وہ اپنے آقا انگریزوں کے قدم رکھنے سے پہلے اپنی پلکوں سے زمین کو صاف کرنے کے قائل تھے، نہ ہندوستان کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت تھی نہ اسلام اور مسلمانوں کی۔

بار بار کے تجربوں کے بعد انگریزی حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں نے ہندوستان کی سرگرمیوں کی مخبری کی خدمت ان کو سپرد کی تھی کیونکہ اب وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ ان کے اخلاص ووفا کی قسمیں کھائی جانے لگی تھیں، حالی نے حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے درجنوں اعتراف اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں ان میں سے چند آپ بھی ملاحظہ فرمالیں اور دیکھیں کہ یہ لوگ سرسیّد کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو کتنی محبت سے یاد کرتے ہیں اور اپنے کس اعتماد کا اظہار کرتے ہیں، حالی تحریر فرماتے ہیں:

"سرجان اسٹریچی نے ۱۸۸۰ء میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محمڈن کالج کمیٹی کے ایڈریس کے جواب میں سرسیّد کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا "کسی شخص نے اس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں سیّد احمد خاں نے دیا میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ میں جن کے ذریعہ ان کی جاں نثاری کا پورے طور پر اظہار کرسکوں، اگر سیّد احمد خاں نہ ہوتے تو ہماری جانیں نواب

محمود علی خاں کی شکار ہو جاتیں[1]۔"

"پال مال گزٹ" مورخہ ۲۹؍مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسیّد کی وفات کے بعد ان کی نسبت جن جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے حالی ہمیں اس کے بارے میں بتاتے ہیں:

"سرکارِ انگریزی اور باشندگانِ ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارک باد دے سکیں جس قدر سرسیّد احمد خاں کی زندگی پر، وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا، اور جو خدمتیں اس نے کیں ان کی قدر وقیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے[2]۔"

مسٹر ایچ، جی، کین ممبر پارلیمنٹ نے اخبار "ہوم ورڈ میل" میں سرسیّد کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی:

"سیّد احمد خاں جس سے میں نے ۱۸۷۸ء میں جب کہ وہ لیجلسٹیو کونسل کا ممبر تھا واقفیت حاصل کی، ٹھیک اس قسم کا شخص ہے، جس کو ہندوستان کا انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی خاص کر مشکل اور خطرے کے وقت میں خواہش کرے گا[3]۔"

یعنی ہندوستان میں انگریز حکام کو سیّد احمد خان جیسے وفادار اور انگریزی حکومت کے حقیقی خیر خواہ کے مشورے کے بغیر کام کرنا مشکل ہوگا، مشکلات وخطرات کے موقعہ پر اس کی جاں نثاری اور فداکاری پر پورا اعتماد اور بھروسہ کیا جاسکتا ہے، حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو اس سے بہتر سے بہتر تعاون حاصل ہوگا۔

سرسیّد کے رسالہ "اسبابِ بغاوت ہند" جو ان کے بڑے کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے اور یقیناً بڑا زبردست کارنامہ ہے لیکن ہندوستانی عوام اور مسلمانوں کے لئے نہیں، بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکومت کے لئے کیونکہ اس کے مندرجات پر عمل کرکے ہی وہ ہندوستان کو غلامی کی مضبوط زنجیروں میں جکڑنے میں کامیاب ہوئے اور اپنی ایک مستحکم اور پائیدار حکومت بنا سکے، اسی رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار

۱۔ حیاتِ جاوید از حالی ص ۳۳۰۔
۲۔ حیاتِ جاوید از حالی ص ۴۸۵۔
۳۔ حیاتِ جاوید از حالی ص ۳۲۲۔

"سینٹ جیمس بجٹ" نے لکھا:

"سیّد احمد خان کی مستحکم وفاداری جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اس ملک کے واسطے سراسر مفید ہے وہ اس کے ان خیالات اور رایوں کو نہایت سنگین کر دیتی ہے جو اس نے بڑے جوش اور فصاحت کے ساتھ کتاب "اسبابِ بغاوت ہند" میں بیان کئے ہیں، یہ کتاب انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت دلچسپ اور فائدہ مند ہے[1]۔"

کرنل گریہم نے اس رسالہ کے متعلق اپنی رائے کے اظہار کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں وہ لکھتے ہیں:

"بعض لوگ سیّد احمد خاں کی "اسبابِ بغاوت ہند" سے متفق نہ ہوں مگر یہ رسالہ جس کو ہمارے خیر خواہ اور وفادار مسلمان شرفاء میں سب سے لائق ترین شخص نے لکھا ہے فی نفسہ نہایت درجہ مفید ہے۔"

اتنے اہم ترین انگریزوں کی رائے آپ کے سامنے ہے ان پر مزید تبصرہ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بس اتنی وضاحت البتہ ضروری ہے کہ تمام ذمہ دار انگریزوں کی رایوں میں ایک قدرِ مشترک صرف سرسیّد کی انگریزوں سے بے لچک وفاداری ہے، وہ انگریزوں کے چشم وابرو کے اشاروں پر چلتے تھے، ان کے سامنے صرف انگریزی حکومت کا مفاد تھا اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ تھا سرسیّد کی زندگی کی تصویر کا ایک رُخ، ان کی تصویر کا دوسرا رُخ صرف مسلمانوں کی دیدۂ بینا کے لئے ہے، آیئے تصویر کے اس رخ کو ایک مسلمان کی نگاہ سے بھی دیکھ لیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ

اب تک آپ کے سامنے میں نے سرسیّد کی تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کیا کہ

۱۔ حیاتِ جاوید از حالی ص ۳۲۵۔

انھوں نے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے اور یہاں کے باشندوں کی غلامی کو دیرپا اور مستحکم بنانے میں کیا رول ادا کیا، اس تفصیل سے جو سچائی سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی عوام یا خاص مسلمانوں کے رہنما اور لیڈر نہیں تھے بلکہ وہ انگریزی حکومت کے نمائندے تھے، ان کو انگریزی حکومت کا مفاد عزیز تھا ملک یا مسلمان کا نہیں۔

ان کا مشن دوسرے نمبر پر یہ تھا کہ پوری مسلمان قوم کو انگریزی حکومت کا مکمل وفادار بنادیں، اس کے لئے انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلسل جد جہد کی، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان بحیثیت مجموعی برطانوی حکومت کے مخلص وفادار بن جاتے ہیں تو پھر انگریزی حکومت واقتدار کو تنہا ہندو قوم کبھی ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی اس لئے بعض اونچے درجے کے انگریزوں نے سرسیّد کو ''وفادار مسلمان شرفا'' کا نمائندہ کہا ہے، اسی لئے ہندو اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرانے کا سبق انگریزی حکومت کو اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں پہلے ہی پڑھا چکے تھے، وہ ایک ایسا مرکز یا محاذ بنانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت ان کی ہم نوا ہو کر انگریزی حکومت کی ثنا خواں ہو جائے اور وہ انگریزی حکومت کو خدا کی رحمت و برکت تصور کرنے لگے، وہ اپنے مضمون ''امام اور امامت'' میں لکھتے ہیں:

''تمام مسلمان جو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایۂ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایسی مہربان اور عادل گورنمنٹ ان کی جان و مال اور عزت اور مذہب پر مسلط کی ہے[1]۔''

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کو جو پچاس ہزار مسلمانوں کے شہید ہونے کے بعد جاری ہوا اس کو الہامی اعلان کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملکہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے[2]۔

---

[1] مقالات سرسیّد حصہ اول مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۷۷۔

[2] حیات جاوید ص ۸۳۲۔

اسی سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان کی ساری جد وجہد مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کے لئے تھی یا انگریزی حکومت سے مرعوب کرکے مسلمانوں میں غلامانہ بے غیرتی وبزدلی، مایوسی، کم ہمتی پیدا کرکے ہر قسم کی جد جہد میں حوصلہ شکنی کے لئے تھی، مسلمانوں کو برطانوی حکومت کا وفادار بنانے کے لئے احادیث وقرآن کو بے تحاشا استعمال کرتے اور معنی ومفہوم کے بیان کرنے میں مجتہد مطلق کی طرح کلام کرتے، اسی سلسلہ میں بہت سے اسلام کے مسائل میں انھوں نے جمہور امت اور مسلمانوں کے سواد اعظم سے اختلاف کرکے خود ساختہ عقائد ونظریات مسلمانوں میں پھیلانے کی کوشش کی، اپنے مقصد اور حکومت سے وفاداری کا سبق پڑھانے میں قرآن وحدیث کے مسلسل استعمال کی وجہ سے ان لوگوں کے حلقہ میں جو سرسیّد کے نظریات سے متفق ہو چکے تھے ان کو ایک مذہبی رہنما کی سی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ وہ ان کو اس سے کہیں بلند وبالا مقام دیتے تھے، جس سال ان کا انتقال ہوا، اسی سال ان کے مقالات کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے جسے مولوی امام الدین گجراتی اور مولوی احمد بابا مخدومی نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا، اس مجموعہ کے سرورق پر سرسیّد کا نام اس طرح لکھا گیا:

''ملک کے جاں نثار، مسلمانوں کے عملی غمخوار، مصلح وریفارمر، مجتہد ومجدد، پیشوائے ملت، امام وقت، اسلام کے عاشق صادق، قوم پر اپنا تن من دھن قربان کرنے والے، جواد الدولہ، عارف جنگ، آنریبل ڈاکٹر سرسیّد احمد خان صاحب بہادر کے، سی، ایس، آئی، ایل، ڈی، ایف، آر، ایس، بانی مدرسۃ العلوم علی گڈھ، مرحوم ومغفور علیہ الرحمۃ[1]۔''

مال کا اسراف ہی ناپسندیدہ نہیں الفاظ کا بے جا اسراف اور بے محل استعمال بھی کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں مگر عقیدت اور غلوئے محبت کا یہ اظہار شاید مرتب کے لئے اپنے اندر کوئی افادیت کا پہلو رکھتا رہا ہو، اس چار سطری نام والقاب کے سلسلہ مں مجھے بس اتنی بات عرض کرنی ہے کہ سرسیّد کے ذہن وقار اور فکر رسالہ کا یہ کمال ہے کہ ۱۸۵۷ء

---

[1] مقالات سرسیّد حصہ اول، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۹۲۔

کے موقعہ پر پورا اسلامی ہند کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ اپنی حکومت واقتدار کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے اپنی ساری قوت وطاقت لگا کر ہارتا ہے اور شکست کے بعد پوری مسلمان قوم دیکھتی ہے کہ جس ظالم وجابر قوم سے ہم نبرد آزما ہیں اسی کی صف میں سر سیّد احمد خاں بھی کھڑے ہیں، اور اسلامی ہند کی ذلت آمیز شکست میں ان کا بھی ہاتھ ہے، اس کے باوجود تحریر وتقریر کے زور پر اسی شخص کو اسلام کا سب سے بڑا فدارکار، اسلام کا عاشق صادق، اور مسلمانوں کا غم خوار اور خدا جانے کیا کیا القاب مسلمان قوم دے ڈالتی ہے، یہ غیرت وخوداری کی موت اور احساس کمتری اور پست ہمتی کی سب سے نچلی اور پست ترین سطح ہے۔

ہندوستان اور عیسائیت

جب لال قلعہ میں انگریزی ریزیڈنٹ رہنے لگا اور بادشاہ کی حدود سلطنت دہلی شہر تک محدود ہوکر رہ گئیں اور ''ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا'' کی منادی ہونے لگی، ملتان سے برما تک انگریزوں کے اختیار میں آگیا تو لندن میں فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان میں فروغ عیسائیت کی مہم چلا کر وہاں کی اکثریت کو عیسائی بنایا جائے تا کہ ہماری حکومت کو استحکام حاصل ہو، اسی نقطۂ نگاہ سے لندن میں ایک تربیتی سنٹر کھولا گیا، جہاں اسلام پر اعتراضات کرنے اور علماء اسلام سے مناظرہ کرنے کی پادریوں کو تربیت دیجاتی تھی، جب تربیت یافتہ پادریوں کی تعداد ہزاروں میں ہوگئی تو پادریوں کی یہ ساری فوج ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لئے بھیج دی گئی اور پورے ملک میں پھیلا دی گئی، حکومت کے عہدہ دار مشنری ذہن ومزاج کے بھیجے جانے لگے، سر ولیم میور جو یوپی کا گورنر تھا خود مشنری تھا، دہلی میں لندن کا اسقف اعظم پادری فنڈر آیا اور دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر اسلام پر اعتراضات کرنے لگا اور انتہائی جارحانہ انداز میں مسلمانوں کو مناظرہ کی دعوت دینے لگا، اسلام کے خلاف اس نے ایک کتاب ''میزان الحق'' لکھی تھی اور اس کو پیش کرکے یہ دعویٰ کرتا تھا کہ یہ کتاب

الہام سے لکھی گئی ہے کوئی مسلمان عالم اس کا جواب نہیں دے سکتا، ہندوستان کے کسی عالم میں اگر جرأت ہو تو اس کا جواب دے یا مجمع عام میں مجھ سے مناظرہ کرکے مذہب عیسوی کو جھوٹا ثابت کردے، یہ وہ دور تھا کہ پورے ہندوستان میں انگریزوں کا رعب داب چھایا ہوا تھا اور کسی کو اس پادری کے جواب میں زبان ہلانے کی جرأت نہیں تھی، گویا پادریوں کی زبان سے ایک جابر وقاہر حکومت بول رہی ہے، اسی طرح ہر بڑے شہر میں پادریوں کا ایک جتھہ مصروف جدوجہد تھا، یہ جہاں بھی عوام میں جاتے تھانے سے کہ کر چند پولیس کے جوان اپنے ساتھ لے جاتے تھے اسلئے عوام کیا خواص تک سہمے ہوئے تھے، ہر شخص کو یقین ہوچکا تھا کہ انگریزی حکومت پورے ہندوستان کو ایک نہ ایک دن بجبر واکراہ عیسائی بنا کر رہے گی، اسی دوران کلکتہ کے لاٹ پادری ای ایڈمنڈ کی کھلی چٹھی ملک میں شائع ہوگئی اور اس نے صاف صاف لکھ دیا کہ:

> ''معلوم ہوتا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ اس مضمون پر سرگرمی کے ساتھ غور کیا جائے کہ سب لوگوں کو ایک ہی مذہب اختیار کرنا چاہئے یا نہیں...... مذہب عیسائی ہی ایسا مذہب ہے جو خدا کے پاس سے براہِ راست الہام کے ذریعہ سے آنے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہی ایسا مذہب ہے جس سے اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں جس کا حال اس سے منکشف ہوتا ہے خوشی حاصل ہوسکتی ہے، دنیا کے کسی مذہب سے اس مذہب کو ممتاز کرنے کے لئے اس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ یہ انسان کی عقل اور دل سے اپیل کرتا ہے اور دنیا میں صرف یہی مذہب ہے جو محض دلیل کے زور سے پھیلا ہے جو قومیں اس مذہب پر اعتقاد رکھتی ہیں سب سے زیادہ غور وخوض کرنے والی اور دنیا میں سب سے زیادہ شائستہ ہیں پس بہر کیف اس مذہب کو حق حاصل ہے کہ اس پر غور کیا جائے[1]۔''

یہ صرف ایک گشتی چٹھی نہیں تھی بلکہ یہ اشارہ تھا کہ حکومت کے ذمہ داروں کو اب اس سمت میں ٹھوس اور مضبوط قدم اٹھانا چاہئے، اور جس طرح ممکن ہو پورے ملک کو

[1] ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن چٹھی پادری ای ایڈمنڈ ص ۸۴۷، ۸۴۸۔

گرجا گھر میں سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا جائے، ہندوستان کے عوام اور خواص سب نے اس اشارہ کو سمجھ لیا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ سہم کر رہ گیا۔

اس صورت حال سے سب سے زیادہ مضطرب اور بے چین مسلمان تھے، کہ ان کی حکومت ہاتھ سے جا چکی اب ان کے مذہب پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش ہو رہی ہے، یہ تمام حالات سرسیّد کی آنکھوں کے سامنے تھے یہ سارے تماشے دہلی میں ہو رہے تھے اور سرسیّد دہلی میں مقیم تھے، لیکن اس قیامت کی گھڑی میں عیسائیت کی طاقت کے ذریعہ تبلیغ پر ان کی زبان سے کبھی ایک لفظ نہیں نکلا، کیوں کہ عیسائیت کی مخالفت انگریزی حکومت کی مخالفت تھی اور سرسیّد کو یہ کسی حال میں منظور نہیں تھا۔

یتیموں کو جبراً عیسائی بنانا

مرادآباد اور اطراف میں زبردست قحط پڑا بے شمار یتیم ہو گئے، سرکاری انتظام میں محتاج خانہ کھولا گیا، سرکاری طور پر یتیم خانے کا انچارج سرسیّد کو بنایا گیا، سرسیّد نے بڑی دلجمعی کے ساتھ اس کام کو کیا افسرانِ بالا تک ان کے حسن انتظام کی رپورٹ گئی، یتیموں میں ہندو اور مسلمان دونوں کے بچے تھے، قحط کی مصیبت سے نجات پا کر اپنے مذہب کے لوگوں میں وہ چلے جائیں گے، ہر سمجھ دار شخص یہی سمجھتا تھا، سرسیّد کا بھی ارداہ جب تک حکومت کی منشا نہیں معلوم تھی، یہی تھا کہ جتنے لاوارث بچے آئیں گے ان میں جو مسلمان ہوں گے وہ مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہوں گے ان کو ہندوؤں کے سپرد کر دیا جائے گا، جب قحط پر قابو پا لیا گیا اور حکومت نے محتاج خانہ بند کرنے کا ارادہ کیا تو قدرتی طور پر لاوارث یتیموں کا نظم کرنا ضروری تھا اسی دوران پادریوں نے کلکٹر مرادآباد سے ان یتیموں کا مطالبہ کیا کہ ان کو ہمیں سپرد کر دیا جائے، کلکٹر نے اس کے فیصلہ کے لئے کمیٹی بنائی جس میں ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ انگریز بھی تھے، سرسیّد کو بھی اس کمیٹی کا ایک رکن بنایا گیا یہی کمیٹی یتیموں کی سپردگی کا فیصلہ کرے گی، سرسیّد چونکہ یتیم خانے کے انچارج تھے اس لئے قدرتی طور پر کمیٹی میں ان کی رائے کا

وزن زیادہ تھا، اور انگریز کلکٹر کے بعد سب سے باا ثر رکن سرسیّد ہی تھے، انگریز افسران کے چشم وابرو کے اشارہ پر متفقہ طور پر فیصلہ کر دیا گیا کہ تمام لاوارث اور یتیم بچے مشنریوں کے سپرد کر دیئے جائیں اور ان تمام مسلمانون اور ہندوؤں سے ان بچوں کو واپس لے لیا جائے جن کی سپردگی میں یہ بچے دیئے گئے ہیں ان سے لے کر عیسائیوں کے حوالے کر دیئے جائیں، سرسیّد نے اس فیصلہ کی مخالفت میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا، بلکہ تائید کرنے والوں میں یہ بھی شامل تھے، البتہ ان سے ان یتیموں کو واپس کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا جو ان کی پرورش میں دیئے گئے تھے، گویا کمیٹی نے یہ اجازت دے دی کہ جو بچے سرسیّد کی ذاتی تحویل میں ہیں وہ ان کے پاس علیٰ حالہٖ رہیں گے لیکن اب سرسیّد کو انگریزی افسران کی منشا معلوم ہوگئی تھی اس لئے انھوں نے ازخود ان یتیموں کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا، سرسیّد کے مداح سوانح نگار حالیؔ خود ہمیں بتاتے ہیں:

> ”وہ بچے زار و قطار روتے تھے، اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے مگر سرسیّد نے اپنے جذبۂ وفاداری کے تحت ان کو واپس نہیں لیا[1]۔“

جب کہ وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمانوں کے ان یتیم بچوں کو زبردستی عیسائی بنانے کے لئے لے جایا جا رہا ہے، اور ان سے ان بچوں کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں تھا اس کے باوجود ان کو زبردستی گھر سے نکال کر عیسائیوں کے مذبح میں بھیج دیا جہاں ان کے دین ومذہب کے قتل کا مکمل بندوبست تھا۔

عیسائیت سے پنجہ آزمائی

ہندوستان میں عیسائیت بڑے رعب داب اور لاؤ لشکر کے ساتھ آئی تھی، عیسائیت کی تبلیغ کے لئے بے شمار لٹریچر شائع ہوتے رہتے تھے اور مفت تقسیم کئے جاتے، ہر طرح کے اجتماعات میں پادریوں کی بڑے ہی جارحانہ لب ولہجہ میں

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۰۔

تقریریں ہوتی رہتی تھیں اور ہندوستان کے خطہ خطہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں سے مناظروں کی بھی دھوم دھام تھی ۱۸۵۴ء کے مناظرہ نے تو اس کی شہرت ہندوستان سے یورپ تک پہنچادی جو آگرہ میں پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے درمیان ہوا تھا، جس میں ڈاکٹر وزیر خاں کا بھی زبردست کردار تھا[1]، مناظرہ کا خاص موضوع انجیل کا محرف ہونا تھا، مسلمان مناظرین نے ناقابل تردید دلائل سے سات آٹھ جگہ تحریف کا ثبوت دیا اور خود پادری فنڈر نے مجمع عام میں اس کا اعتراف کرلیا، اور مسلمانوں کی فتح کا شور مچ گیا، مناظرہ میں انگریزی حکومت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ دار شریک تھے، پادری فنڈر کی اس کھلی شکست پر بہت جز بز ہوئے، پادری فنڈر کو ہندوستان سے راتوں رات فرار کرنا پڑا، یورپ میں اس مناظرہ کا اتنا اثر ہوا کہ پادری فنڈر اپنے عہدے سے معزول کردیا گیا، وہ لندن سے بھاگ کر ترکی گیا، اتفاق امر انھیں دنوں مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی ہندوستان سے ہجرت کرکے مکہ معظمہ پہنچے ہوئے تھے، ترکی خلیفہ نے جب پادری فنڈر کی لن ترانیاں سنیں تو اس نے تحقیق کرائی کہ ہندوستان میں ہونے والے مناظرہ کی صحیح صورت حال کیا ہے تو مکہ کے گورنر نے خلیفہ کو لکھا کہ ہندوستان میں پادری فنڈر کا جس عالم سے مناظرہ ہوا تھا وہ آج کل مکہ میں ہیں خلیفہ نے گورنر کو حکم بھیجا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب کو فوراً ترکی بھیج دیا جائے۔

پادری فنڈر کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ ترکی سے بھاگا اور پھر پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں مر کھپ گیا کیونکہ پھر اس کے بعد اس کا کہیں نام نہیں سنا گیا، اس مناظرہ نے ہندوستان میں ہوا کا رخ بدل دیا، مسلمان جو اب تک حکومت کے ڈر کی وجہ سے سہمے ہوئے تھے ان میں جرأت بڑھی اور ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں علماء اسلام نے پادریوں کا تعاقب شروع کردیا اور ان کو گھیر گھیر کر مناظرہ کرنے لگے، اور مجمع عام میں ان کے خلاف تقریریں کرنے لگے اور پادریوں کی ہوا اکھیڑ دی، پادریوں کے حوصلے

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "احیاءِ اسلام کی ایک عالمگیر تحریک" مؤلفہ اسیر ادروی ناشر دار المؤلفین دیوبند۔

پست ہوگئے مسلمانوں نے سانپ کا پھن کچل کر رکھ دیا کہ اس کے ڈسنے کا امکان کم سے کم ہوتا چلا گیا۔

بائبل کی تفسیر

آگرہ میں جب مناظرہ ہورہا تھا سرسیّد دہلی میں تھے اور سرکاری عہدہ دار تھے، وہ اس مناظرہ سے پوری طرح باخبر تھے، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرسیّد کو پادریوں کی اس شکست سے کچھ خوشی نہیں ہوئی بلکہ ایک گونہ ان کو رنج اور ملال ہوا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مناظرہ کے بعد ہی انھوں نے بائبل کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کرلیا، اس کے لئے انھوں نے بڑی محنت کی، کافی سرمایہ لگایا اور مسلمان مناظرین کے اس دعویٰ تحریف کے برخلاف انھوں نے انجیل کو غیر محرف ثابت کرنے کے لئے پورا زورِ قلم صرف کردیا ہے۔

۱۸۵۴ء کے مناظرہ آگرہ سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک یعنی جب تک عیسائی مشنریوں کا زور تھا اور وہ تبلیغ عیسائیت کے لئے انتھک جد وجہد کرتے رہے علماء اسلام عیسائیت کے باطل اور ناقابل عمل ہونے کے لئے صرف ایک دلیل دیتے رہے کہ تمہارے ہاتھوں میں جو انجیل ہے وہ خدا کا کلام نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو انجیل اُتری تھی اس کے اندر کتر بیونت کرکے عیسائیوں نے اس کو ناقابل اعتبار بنادیا ہے، اور ہر جگہ پادریوں کو مناظروں میں اسی تحریف کے موضوع پر ذلت آمیز شکستیں ہوتی چلی گئیں، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا منصور دہلویؒ جو عیسائیوں کے آخری دور میں مناظرہ ومباحثہ کرنے والے بزرگوں میں ہیں ان تمام حضرات نے اسی پہلو سے عیسائی مناظرین کی مناظروں اور مباحثوں میں زبانیں بند کیں اور پادریوں کو مجمع عام میں رسوائیاں اٹھانی پڑیں۔

ان حالات میں سرسیّد کا بائبل کا تفسیر لکھنا کیا معنی رکھتا ہے، کیا وہ بائبل کی تفسیر لکھ کر اسلام کی کوئی خدمت کرنا چاہتے تھے؟ کیا اسلام اور مسلمانوں کو بائبل کی تفسیر کی ضرورت تھی؟ جب ان میں سے کوئی بات نہیں تھی تو اس بے موسم کی راگنی کا حاصل کیا

تھا؟ عقل اس کی توجیہ سے قاصر ہے، حالی جو سرسیّد کی اسی طرح مدح کرتے ہیں جیسے عربی کا مشہور شاعر متنبّی اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتا رہتا تھا، حالی نے بھی سرسیّد کے ہر غلط کام کی تاویل کو اپنا فرض منصبی بنا رکھا ہے، یہاں بھی انھوں نے یہی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے، اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کی جائیں[1]۔''

دیکھا آپ نے؟ ہندوستان میں اسلام اور عیسائیت میں ایسی خون ریز جنگ چھڑی ہوئی ہے کہ ہندوستان میں یا تو اسلام زندہ رہے یا عیسائیت، اس جنگ کے نتیجہ پر ہندوستان میں اسلام کی موت وحیات منحصر ہے اور مسلمان اپنی پوری قوت مدافعت سے کام لے کر اسلام کی زندگی کے لئے موت وزیست کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور عیسائیت کے قاہرانہ وجابرانہ حملوں سے بچانے کی جد وجہد میں مصروف ہیں اور سرسیّد اسلام اور عیسائیت میں مطابقت ثابت کر کے مسلمانوں کی قوت مدافعت کو کمزور کرنے کی جد وجہد کر رہے ہیں، یہ اسلام کی نہیں عیسائیت کی ہمدردی میں کیا جا رہا ہے اور حالی اس کو سرسیّد کی اسلامی خدمت سے تعبیر کرتے ہیں، حالی کے ہاتھ میں قلم ہے اس کو کون پکڑ سکتا ہے، حالی کا کردار سرسیّد کی سوانح میں بالکل وہی ہے جو آج کل کی عدالتوں میں وکیلوں کا ہوتا ہے، مقدمہ چاہے کتنا ہی جھوٹا اور بے بنیاد ہو اس کو زور بیان اور طاقت لسانی سے سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عدالت کو دھوکے میں رکھ کر اپنے موافق فیصلہ کرانے کی انتھک جد وجہد کرتے ہیں، حالی بھی سرسیّد کے مقدمہ میں جو ملت اسلامیہ کی عدالت میں پیش ہے ایک ماہر قانون وکیلوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۳۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مشنریوں کے ہزاروں جتن کے باوجود چند ہی غیر مشہور مسلمان عیسائی ہوئے کیونکہ تمام مسلمان بلا استثناء عیسائیت کو باطل اور گمراہ سمجھتے تھے اور اس کی طرف سے ان کے دلوں میں نفرت بیٹھی ہوئی تھی اور ان کا بے شمار لٹریچر جو ملک میں برابر تقسیم ہوتا رہتا تھا کبھی کوئی پڑھنے اور دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا، اگر ایسی بات نہ ہوتی تو جتنا جبر کیا جا رہا تھا اور مشنریوں کی طرف سے لالچ دیا جا رہا تھا ہزاروں اور لاکھوں پست حال مسلمان عیسائی ہو گئے ہوتے، سرسیّد مسلمانوں کے دلوں سے عیسائیت سے اسی نفرت کو دور کر کے ان کو عیسائیت قبول کرنے کے لئے ہموار کرنے اور عیسائیت کے لئے مسلمانوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لئے بائبل کی یہ تفسیر لکھ رہے تھے اور خاص طور پر مسلمان مناظرین جو تحریف انجیل کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر پادریوں کو میدان مناظرہ میں شکست دے رہے تھے، اس کی تردید کر کے پادریوں کے ہاتھوں میں نیا ہتھیار دے رہے تھے، خود حالی ہمیں بتاتے ہیں کہ سرسیّد کا کیا مقصد تھا:

''مسلمان موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے، ان کو بائبل اور اس کی تفسیروں وغیرہ کے مطالعہ سے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ بائبل کی تفسیر بالکل حدیث اور قرآن کے مطابق ہو سکتی ہے[1]۔''

سرسیّد مسلمانوں کے ہاتھوں سے وہ تلوار چھین لینا چاہتے ہیں کہ جس تلوار سے کام لے کر مسلمانوں نے ہندوستان میں عیسائیت کی شہ رگ کو کاٹ دیا تھا اور اس کی موت یقینی ہو گئی تھی، وہ بائبل کی تفسیر لکھ کر اسلام کی نہیں عیسائیت کی خدمت کرنا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب یہ تفسیر بائبل شائع ہوئی تو عیسائی دنیا میں مسرت اور خوشی کر لہر دوڑ گئی، مشہور مستشرق ڈاکٹر گارسن دی تاسی جو پیرس یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا استاذ تھا اور پر جوش عیسائی تھا، ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ سے اس کو بڑی

[1] حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۱۲۔

دلچسپی تھی وہ ہر سال یونیورسٹی میں اپنے طلبہ کے سامنے ایک لکچر دیتا تھا اس میں اُردو کی مطبوعات کے علاوہ عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں جو کتابیں اُردو میں لکھی جاتی تھیں اُن پر تبصرہ کرتا تھا، جب سرسیّد کی کتاب اس کے پاس پہنچی تو اس نے اس سال کے اپنے اٹھارہویں لکچر میں جو ۲۰/ستمبر ۱۸۶۸ء کو دیا تھا، کہا:

"اُردو کی بعض دوسری کتابیں جنھیں ہم خالص مسیحی تو نہیں کہہ سکتے لیکن نیم مسیحی ضرور کہہ سکتے ہیں، ان میں وہ کتاب شامل ہے جو ایک مسلمان عالم نے بائبل کی تفسیر پر لکھی ہے، یہ کتاب اپنے رنگ میں اجتہادی رنگ رکھتی ہے اور فاضلانہ بھی ہے، میری مراد سیّد احمد خان کی تفسیر بائبل ہے[1]۔"

ایک مشنری ذہن ومزاج کا عیسائی سرسیّد کی کتاب کو عیسائی کی کتاب تو نہیں نیم عیسائی کی کتاب کہتا ہے، یعنی مشنری لٹریچر تو براہ راست عیسائیت کی دعوت دیتا ہے، سرسیّد کی تفسیر بائبل اس راہ کے کانٹوں کو چن چن کر مسلمانوں کو عیسائیت کی منزل تک پہنچنے میں سہولت پہنچانے والی کتاب ہے، مسلمان تو اس وقت اسلام کی طرف سے مدافعت میں موت وزیست کی لڑائی لڑ رہے ہیں، ان کو عیسائیت کے فضائل ومناقب جاننے کی کیا ضرورت تھی؟ حقیقت صرف اتنی ہے کہ انگریزی حکومت جو ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کے لئے خفیہ طور پر پوری طاقت صرف کر رہی تھی، سرسیّد نے بائبل کی یہ تفسیر لکھ کر حکومت کی منشا اور اس مشن میں مدد پہنچانے کے لئے لکھی تھی، اس کے علاوہ ان کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

بائبل کی تفسیر لکھنے کا مقصد

بائبل کی تفسیر لکھنے کی منشا سرسیّد نے خود اپنے ایک خط میں لکھی ہے جو انھوں نے جان میوسن آرنلڈ کو لکھا تھا، انھوں نے اپنی کتاب "قرآن اینڈ بائبل" مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں یہ خط نقل کیا ہے، اس میں سرسیّد نے بند لفظوں میں ان کو سمجھایا ہے کہ مسلمان

[1] خطبات گارسن دتاسی جلد ۲ ص ۲۰۱ تا ۲۰۲، اردو ترجمہ تصحیح ونظر ثانی ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس شائع کردہ پاکستان۔

عیسائیوں کے لٹریچر کو غلط، مہمل اور لغو سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ نہیں پڑھتے اور پادریوں کو مسلمانوں میں عیسائیت کو پیش کرنے کا سلیقہ نہیں اس لئے ان کو کامیابی نہیں ملتی ہے، میں نے یہ تفسیر لکھ کر مسلمانوں کے اس ذہن کو بدلنے کی کوشش کی ہے، حالی نے اس خط کا جو اقتباس دیا ہے میں وہی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

"وہ جان میوسن آرنلڈ کو لکھتے ہیں کہ بے شک آپ کا خیال صحیح ہے کہ کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی، خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آباء واجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو امر کہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بے کار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور یقین کرتے رہے ہیں اور ان کے اس مضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے، ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہوا اور دونوں کے دل بُرے ہوں اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا[1]۔"

سرسیّد کہتے ہیں کہ پادریوں کو اپنے مذہب کے حق ہونے پر دلائل پیش کرنے کا سلیقہ نہیں اس وجہ سے ان کی ساری جد وجہد رائیگاں جارہی ہے اور مسلمان ان کو خاطر میں نہیں لاتے، سرسیّد بائبل کی تفسیر لکھ کر پادریوں کو مسلمانوں میں تبلیغ عیسائیت کا طریقہ اور سلیقہ بتاتے ہیں سرسیّد کا جملہ "کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا" معنی خیز ہے اور آرنلڈ جیسے مشنری ذہن کے انسان کو بڑا اپیل کرنے والا بھی۔

تفسیر بائبل آرنلڈ کی نظر میں

جان میوس آرنلڈ نے سرسیّد کی تفسیر بائبل پڑھ کر جو نتیجہ نکالا وہ ہے کہ سرسیّد نے

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۶۔

عیسائیوں پر عیسائیت کی تبلیغ کرنے والے مشنریوں پر اور ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو رعب داب، جبر اور طاقت کے بل پر عیسائی بنانے والوں پر اور ساری دنیا کے مشنریوں پر یہ کتاب لکھ کر زبردست احسان کیا ہے اور اب عیسائیت کو حق اور اسلام کو باطل اور قرآن کو جھوٹا ثابت کرنا سرسیّد کی اس کتاب کی وجہ سے آسان ہوگیا ہے[1]۔

حالی نے آرنلڈ کا آخری جملہ ''قرآن کو جھوٹا ثابت کرنا آسان ہوگیا'' نقل کر کے آرنلڈ کا مذاق اڑایا ہے اور کہا کہ معلوم نہیں انھوں نے کہاں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے؟ یعنی یہ حقیقت نہیں، یاد رہے کہ حالی ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی تحریروں میں انگریزوں کے اقوال اتنی اہمیت وعقیدت کے ساتھ نقل کرتے ہیں جیسے وہ وحی اور الہام ہو اور اس کو اتنا مستند بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اب اس کے خلاف نہیں ہوسکتا، وہ آنکھ بند کر کے مستشرقین اور علماء یورپ کے اقوال کو بطور سند ہمیشہ نقل کرتے آئے ہیں اگر آپ چاہیں تو مقدمہ شعر وشاعری سے ان کی ایک پوری فہرست نقل کرسکتے ہیں لیکن آرنلڈ جیسا مصنف جب اپنی کتاب ''قرآن اور بائبل'' میں سرسیّد کی کتاب پر اپنا تأثر لکھتا ہے تو وہی حالی آرنلڈ کا مذاق اڑاتے ہیں، اس لئے کہ اس سے سرسیّد پر پڑی ہوئی نقاب سرکتی ہوئی نظر آتی ہے اور ان کی قدر وقیمت گھٹنے لگتی ہے، مگر اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی، سرسیّد کی کتاب پڑھ کر آرنلڈ نے جو تأثر لیا، یقیناً کتاب سے کتاب کے پڑھنے والے وہی تأثر لیں گے جو آرنلڈ نے لیا ہے، آپ آج مستشرقین اور علماء یورپ کو اتنا احمق کیوں سمجھنے لگے ہیں جب کہ کل ان کی ہر بات آپ کے لئے سند تھی۔

زہر یا تریاق؟

سرسیّد نے بائبل کی تفسیر لکھ کر مسلمانوں کو بغلی گھونسہ مارا ہے، خواجہ حالی اسے اسلام کی خدمت سے تعبیر کرتے ہیں، زہر کو تریاق کا نام دینا حالی کے لئے زیبا نہ تھا، شاید یہ ان کی مجبوری تھی، مگر ایک خالی الذہن انسان جو دوستی ودشمنی کے حدود سے باہر

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۹۔

ہے جو سچائی ہے جو حقیقت ہے وہی تسلیم کرے گا، بائبل کی تفسیر لکھ کر سرسیّد نے اپنے محفوظات ذہنی کو آشکارا کردیا ہے، یہ ہے سرسیّد کا وہ کارنامہ جن کو مجتہد عصر اور مجدد وقت کہا جاتا ہے بلکہ ولی، قطب اور ابدال اور جانے کیا کیا کہا جاتا ہے، حالی بھی سرسیّد کو اسی بلند مقام پر فائز دیکھتے ہیں جیسا کہ اپنی کتاب میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہم سرسیّد کے افعال اور اخلاق وعادات میں وہ خوبیاں پاتے ہیں جو بڑے بڑے مشائخ واہل اللہ میں نہیں دیکھی گئیں، بلاشبہ وہ آخر عمر میں بہ سبب فربہی مفرط اور کبرسن کے نماز روزے کے پابند نہ رہے تھے[1]''

حالی کو متضاد باتیں کہنے میں جیسے کوئی جھجک نہیں، ان کے نزدیک نماز روزے کی پابندی نہ ہونے کے باوجود کوئی شخص عام مشائخ اور اہل اللہ سے بلند مقام پر فائز ہوسکتا ہے، معلوم نہیں ان کے پاس وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر سرسیّد کی ولایت وقطبیت کو پرکھتے ہیں اور اس طرح وہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کا مذاق اڑاتے ہیں، سرسیّد صاحب جیسے ولی کامل اور خواجہ حالی جیسے معتقد ؎

ہم چنیں مکتب وہمیں مُلا ❁ کارِ طفلاں تمام خواہد شد

سرولیم میور کا جواب

کچھ لوگ میرے اس انکشاف پر سرسیّد کی بعض دوسری تصنیفات کو پیش کریں گے جیسے انھوں نے سرولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' کا جواب یا خطبات احمدیہ ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام کا درد ان کے سینہ میں نہیں تھا تو وہ یہ کتابیں کیوں لکھتے؟

اس سلسلہ میں مختصر بات یہ ہے کہ میں نے سرولیم میور کی ''لائف آف محمد'' نہ پڑھی ہے نہ دیکھی ہے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں اور وہ بھی اردو زبان میں اس کتاب کے جواب کی ضرورت تھی یا نہیں، سرولیم میور کی کتاب انگریزی میں ہے ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں سے شاید دو چار نے اس کتاب کو پڑھا ہو،

[1] حیات جاوید از حالی ص ۵۲۲۔

ان کی کتاب سے اسلامی ہند کے مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچے گا اس کا کوئی احتمال ہی نہیں تھا اور اسلام سے بدگمان ہوکر عیسائیت قبول کرنے کا اندیشہ تو قطعاً نہیں تھا حالات کا تقاضہ کچھ اور تھا اس لئے مسلمانوں نے اس کے جواب کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور بعد کے زمانہ نے ثابت کردیا کہ مسلمانوں نے اس فضول کام میں اپنی انرجی ضائع نہیں کی یہ ان کی دانشمندی تھی۔

سرسیّد نے جواب لکھا؟ میں مسلسل کہتا آرہا ہوں کہ سرسیّد بہت ذہین اور زمانہ کے نبض شناس اور مسلمانوں کی نفسیات سے آگاہ تھے، اب دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں نے عیسائیت کے خلاف اپنی مہم تیز کردی ہے اور مناظرہ اکبرآباد کے بعد ان کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے مسلمانوں کی توجہ ادھر سے ہٹانے کے لئے انھوں نے سرولیم میور کی کتاب کی اہمیت بتا کر اس کا جواب لکھنے کا اعلان کرایا، سرسیّد کے اس کام کی مثال ٹھیک اس معالج اور ڈاکٹر کی ہے کہ آدمی کہ شہ رگ کٹ گئی ہے اور اس کے جسم کا خون اتنی روانی سے جاری ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں پڑ چکی ہے، اس کا خون روکنے اور علاج کرنے اور اس کی جان بچانے کے زود اثر علاج کے بجائے اس کے ہاتھ میں چبھ جانے والی سوئی کے زخم کے علاج پر پوری توجہ صرف کر رہا ہے اور بہتے ہوئے خون سے صرف نظر کر رہا ہے جو جلد ہی اسے موت کی آغوش میں لے جانے والا ہے، سرسیّد بھی اسی معالج کا کردار ادا کر رہے تھے، وہ کھلی ہوئی آنکھوں سے اس جبر کو دیکھ رہے تھے جو عیسائیت کے پھیلانے میں حکومت کے عہدیدار اختیار کر رہے تھے، خود ان کی تحریروں میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ وہ اپنے ایک رسالہ میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

''کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کی رسم و رواج پر لا ڈالے[1]۔''

۱۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۵۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ سرسیّد نے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں جتنی باتیں لکھی ہیں وہ حکومت کی شکایت کے طور پر نہیں لکھی ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے ہندوستان کے ماحول اور فضا میں وہ طریقہ کار مناسب نہیں ہے، کام کی مخالفت نہیں، طریقہ کار کی شکایت تھی، پورا ہندوستان عیسائی ہو جائے اس سے سرسیّد کو کوئی سروکار نہ تھا صرف انداز تبلیغ کی مخالفت کر رہے تھے جس سے ملک میں انتشار اور بے چینی بڑھ رہی تھی، انھوں نے اسی رسالہ میں اپنے اس واقعہ کو بھی لکھ دیا ہے جو یتیموں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، وہ لکھتے ہیں:

''۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی وشمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے نمونے گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اسی طرح مفلس اور محتاج کر کر اپنے مذہب میں لے آئیں گے[1]۔''

ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ سرکاری افسران تبلیغ عیسائیت میں دلچسپی لیتے ہیں اور پادریوں کو مدد پہنچاتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''سب جانتے ہیں کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کر رکھا ہے، گورنمنٹ سے تنخواہ پاتے ہیں گورنمنٹ اور حکام انگریزی ولایت زا جو اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت روپیہ دیتے ہیں اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں، بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے ہیں کہ ہماری کوٹھی پر ان کے پادری کا وعظ سنو[2]۔''

پادریوں کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے اسی رسالہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ:

''(پادری صاحبان) غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ گاہ، میلہ میں جاکر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا، بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا چپراسی جانے لگا[3]۔''

۱۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۶۔
۲۔ حوالہ مذکور۔
۳۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۶۔

کلکتہ کے لاٹ پادری کی چٹھی جس نے پورے ملک میں زلزلہ ڈال دیا تھا سر سیّد اس سے خوب واقف تھے اور جو اس کا ردعمل ہوا اس سے بھی آگاہ تھے، انھوں نے عیسائیت کی چیرہ دستیوں کی صحیح تصویر کشی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد ورفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک ہونا چاہئے اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ، میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا، اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اور ان کو کرستان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو، سب لوگ بے شک یہ سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی؟ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بہ سبب لالچ نوکری کے کرستان ہوگئے، ان چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہلکاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی، لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجائے گی کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو؟ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں[1]۔''

ایسے ماحول اور ان حالات میں سر سیّد بائبل کی تفسیر لکھ رہے ہیں اور اس کی غیر محرف ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو سمجھا رہے ہیں کہ موجودہ انجیل قرآن

۱ رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۷، ۸۱۸۔

وحدیث کی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور سر ولیم میور کی انگریزی کتاب کا اردو میں جواب لکھ رہے ہیں، اسلام پر یورپ کے لوگ انگریزی میں پڑھیں اور سر سیّد کی کتاب اردو میں ہندوستان کے لوگ پڑھیں، سر سیّد بحیثیت سرکاری ملازم ہونے کے یہ بھی جانتے تھے کہ جن لوگوں نے اکبر آباد مناظرہ میں یورپ کے مایہ ناز پادری کو مجمع عام میں شکست دی تھی ان سے انتقام لینے کے لئے ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے نام وارنٹ جاری کیا گیا، گھوڑ سوار پولیس ان کی گرفتاری کے لئے بھیجی گئی، اور پھر کس طرح اور کتنی مصیبتوں سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں مکہ پہنچے؟ یہ بڑی ہی دردناک کہانی ہے، مکہ مکرمہ میں بھی گرفتاری کی کوشش کی گئی مگر خدا نے بچالیا[1] ان دونوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ انھوں نے پادریوں سے مناظرہ کرکے ان کو ذلت آمیز شکست دی تھی اور حکومت کے منصوبہ کی راہ میں سد سکندری کھڑی کردی تھی، یہ تھا تبلیغ عیسائیت کے سلسلہ میں ہندوستانیوں پر جبر وستم، حکومت کا ہر عہدہ دار چنگیز وہلاکو بنا ہوا تھا ایسے حالات میں سر سیّد مسلسل کتابیں لکھ رہے ہیں، رسالے، مضامین اور مقالات تہذیب الاخلاق میں شائع کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں عیسائیت کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو؟

سر سیّد کی دیگر تصانیف

حالی نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ دہلی اور آگرہ میں مشنریوں کے کاروبار پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جابجا مباحثہ ہونے لگے اس وقت سر سیّد کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے جوابات لکھے جائیں، سر سیّد اور مشنریوں کا جواب؟ حالی نے لکھا ہے کہ ''تبیین الکلام'' اسی مقصد سے لکھی گئی، یہ پڑھ کر انتہائی حیرت ہوئی، اس میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات کے بجائے لوگوں کو خود سر سیّد کے ایمان میں شبہ ہونے لگا جیسا کہ سر سیّد کے نام سیّد مہدی

۱ تفصیل کے لئے دیکھئے ''تحریک آزادی اور مسلمان'' ناشر دارالمؤلفین دیوبند ص ۷۷ و ۹۱۔

علی خاں نے غصہ میں بھرے ہوئے خط میں لکھا ہے[1]۔ اس کتاب کا مشنریوں کے جواب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، لکھی بھی تو بائبل کی تفسیر لکھی جس میں عیسائیوں کو عیسائیت کے حق ہونے کو ثابت کرنا آسان ہوگیا، سرسیّد اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی میں سچے تھے تو تفسیر کے بجائے وہی کتاب لکھ کر مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھ دیتے تو شاید ان کا زخم کچھ مندمل ہوجاتا، حالی نے مشنریوں کے جواب کی بات سرسیّد کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے یوں ہی کہہ دی ہے۔

وزیرے چنیں شہر یارے چناں

عیسائیت ناکام ہوگئی

ہندوستان میں عیسائیت جس لاؤلشکر کے ساتھ آئی تھی اور جس جبر وتشدد سے کام لے کر انگریزوں اور مشنریوں نے مذہبی حیثیت سے بھی ہندوستان کو فتح کرنے کا خواب دیکھا تھا وہ شرمندہ تعبیر نہیں ہوا، یہ صرف مسلمانوں کی سخت جانی تھی کہ اپنی ساری مظلومیت کے باوجود انھوں نے عیسائیت کا مقابلہ کیا اور ہندوستان کی سرزمین سے اس کو ذلیل ورسوا کر کے شہر بدر کردیا، سرسیّد نے اس شکست کو فتح سے بدلنے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے ان کی کوششوں کو پائے حقارت سے ٹھکرادیا، اور اپنی زندگی ہی میں ان کو اپنی ناکامی کا بار بار تجربہ ہوتا رہا اس مسلسل ناکامی اور شکست نے ان میں جھنجھلاہٹ پیدا کردی اور اس کا غصہ انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھ کر اتارا اور تیرہ صدیوں کے علماء اور مفسرین کے کارناموں پر انگریزی برش سے سیاہی پھیر دینے کی کوشش کی لیکن جب حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں، جب ذہن پر ناکامیوں کی مسلسل ضرب پڑتی ہے تو کُند ہوجاتا ہے، اس کی قوت برداشت تو ضرور بڑھ جاتی ہے لیکن ذہن ٹھس ہوجاتا ہے، اور ذہانت وفطانت اور تدبر وفراست کی بجلی جو اس میں کار فرما رہتی ہے وہ رخصت ہوجاتی ہے، سرسیّد بھی تفسیر قرآن میں اسی کیفیت سے

[1] حیات جاوید از حالی ص ۵۳۲، ۵۳۳۔

دوچار رہے اور اس کے نتیجہ میں وہ تفسیر کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے، کیونکہ جہاں تک وہ اس راہ میں چلے وہ صراط مستقیم سے اتنا منحرف ہوچکے تھے کہ پھر ان کا اسلام کے صراط مستقیم پر لوٹ کر آنا ناممکن ہوگیا تھا، اس لئے انھوں نے راہ کی سختیوں سے چور ہوکر راستے ہی میں رختِ سفر اتار دیا اور سفر آخرت اختیار کرلیا۔

تفسیر احمدی

یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ اپنی دو ایک نسلوں کے لئے معاش اور اعزاز وافتخار کے وسائل فراہم کر جائے اور خود اپنا دامن زاد آخرت سے خالی رہ جائے اور وہ بھی اس حال میں کہ ساری دنیا کی لعنت وفضیحت کا سامنا کرنا پڑے، لوگوں میں اس کی عظمت واحترام کے بجائے اس کو قومی دشمن، مذہب مخالف، اور اسلامی تہذیب وتمدن کو ڈائنامیٹ کرنے والا تصور کیا جانے لگے، ایسے حالات میں اس نے اپنی چندروزہ زندگی کے لئے دنیاوی عیش وعشرت کے لئے کچھ ''متاع کاسد'' حاصل کرلی تو یہ اس کی کامیابی نہیں، ناکامی ہے۔

سرسیّد نے ساری زندگی انگریزی حکومت سے مکمل اور بلا شرط اور بے لچک وفاداری کے ساتھ گذاری اور حکومت کے معتمد علیہ بن گئے، دنیاوی اعتبار سے یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے اگرچہ پوری ہندوستانی قوم کے جذبات انگریزی حکومت اور ان کے ہم نواؤں کے خلاف رہے، سرسیّد عیسائیت کے فروغ میں تعاون دے کر مسلمانوں کی نگاہوں سے گر گئے اور پھر یورپین تہذیب کی مسلمانوں میں اشاعت کے لئے انھوں نے قرآن کو استعمال کرنا شروع کردیا تو پوری ملت اسلامیہ کے سینے غم وغصہ کی دہکتی ہوئی بھٹی بن گئے، کیونکہ انھوں نے اپنے تمام خود ساختہ نظریوں کی صداقت ثابت کرنے کے لئے بلاجھجک آیات قرآنی کو استعمال کرنا شروع کردیا، یہ بات دیندار مسلمانوں کے حلقے میں ناقابلِ برداشت ہوگئی، اس لئے اس کا ردّعمل ہوا اور بہت ہی سخت ردّعمل ہوا، ان کے خلاف فتوے مرتب ہوئے اور عرب وہند کے

مفتیوں نے بڑے سخت لب ولہجہ میں اظہار خیال کیا جیسا کہ حالی نے لکھا ہے[1]، چونکہ یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے اس لئے میں اس سے صرف نظر کرتا ہوں۔

تفسیر احمدی کے کچھ نمونے

یہ تفسیر سرسیّد نے ہر طرح کی بندشوں سے آزاد ہوکر لکھی ہے اس لئے جمہور امت اور ملت اسلامیہ کے متفقہ عقائد، نقطۂ نگاہ، جذبات وخیالات اور مستند مفسرین کی تصریحات کے خلاف ہے، سرسیّد نے زیادہ تر اپنی عقل، سوجھ بوجھ، غور وفکر اور من مانی توجیہہ وتاویل پر بھروسہ کیا ہے بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انھوں نے خود ایک نظریہ بنالیا اور اس کی روشنی میں تفسیر لکھنے لگے اور آیات کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریے کی تائید میں اس کو پیش کر دیا۔

مستند علماء نے ان کی تفسیر کے رد میں مستقل کتابیں لکھی ہیں مولانا محمد علی بچھرایونی جو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہمراہ مباحثہ شاہجہانپور میں شریک ہوئے تھے انھوں نے اس کے رد میں ''البرہان'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے مولانا عبدالحق حقانی نے اپنی تفسیر کے ضخیم مقدمہ میں مفصل تبصرہ وتنقید کی ہے، حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے ان ہفوات کی ایک مفصل فہرست مرتب کردی ہے میں اسی فہرست کا تھوڑا سا حصہ پیش کرتا ہوں، آپ خود اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دل سے غور کریں، آپ کا ایمان آپ کا ضمیر کیا فیصلہ کرتا ہے، میں نہ مفتی ہوں نہ فتویٰ دینا میرا مشغلہ ہے، آپ کے ایمان اور آپ کے ضمیر کے فیصلے کے لئے بلا اظہار رائے اور بلا تبصرہ پیش کرتا ہوں، تو دانی حساب کم وبیش را۔

حضرت آدم، ملائکہ اور ابلیس کا قصہ فرضی ہے اور صرف تمثیل ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ (تفسیر احمدی ج ۱ ص ۵۲ تا ۶۹، مطبوعہ مفید عام آگرہ)

جنت اور دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں نہ اس کا کوئی وجود خارجی ہے۔ (تفسیر احمدی

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے حیات جاوید از حالی ص ۱۴۱ سے ۱۵۵ تک۔

مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ ج ۱ ص ۱۰)

نامۂ اعمال کا لکھنا، کراماً کاتبین کا مقرر ہونا، اعمال کا تولا جانا ایک افسانہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ (ج ۳ ص ۱۰۲، ج ۶ ص ۴۲)

روزہ رکھنا سب پر فرض نہیں جس کا جی چاہے روزہ رکھے جس کا جی چاہے فدیہ دے کر خود کھائے پیئے چاہے جوان ہو یا بوڑھا۔ (ج ۱ ص ۲۲۸)

فرشتوں کا کوئی وجود نہیں، جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل نام فرضی ہیں۔ (ج ۱ ص ۴۶ و ۱۴۳ تا ۱۵۴، ج ۳ ص ۴۷)

شیطان یا ابلیس صرف ایک افسانہ ہے اس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ (ج ۱ ص ۴۷ تا ۵۲)

قیامت میں صور کا پھونکا جانا اس کی کوئی اصلیت نہیں، صور کوئی چیز نہیں۔ (ج ۳ ص ۵۴)

انبیاء کے معجزات کی کوئی حقیقت نہیں، معجزات بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ (ج ۱ ص ۱۷، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ج ۲ ص ۲۹)

موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریائے نیل میں راستہ بن جانا بے حقیقت ہے۔ (ج ۱ ص ۷۱ تا ۱۰۰)

موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ضرب سے بارہ چشموں کا پھوٹنا، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ (ج ۱ ص ۱۱۱ تا ۱۱۳)

رفعنا فوقکم الطور میں جو پہاڑ کا سر پر اٹھائے جانے کی تفسیر احمقانہ ہے یہ بے بنیاد بات ہے۔ (ج ۱ ص ۱۱۵)

فکونوا قردۃ خاسئین، اصحاب سبت کی صورتوں کا مسخ ہو جانا غلط اور بے حقیقت ہے۔ (ج ۱ ص ۱۱۷ تا ۱۱۹)

قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا حکم الٰہی نہیں ہے۔ (ج ۱ ص ۱۸۶ تا ۱۹۴)

شہیدوں کا زندہ رہنا صحیح نہیں ہے۔ (ج ۱ ص ۱۹۸)

حجر اسود کا بوسہ ثواب کا کام نہیں، حج میں ننگے سر ننگے بدن رہنا لغو ہے۔ (ج ۱ ص ۲۴۸ تا ۲۵۷)

سود کی بہت سی قسمیں جائز ہیں جب کہ شریعت میں حرام ہیں۔ (ج ۱ص ۲۹۸ تا ۳۱۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے، یہ غلط خیال ہے۔ (ج ۲ص ۲۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا صحیح نہیں ہے۔ (ج ۲ص ۲۴)

گردن مروڑی ہوئی چڑیوں کا کھانا حلال ہے۔ (ج ۲ص ۱۸)

چور کا ہاتھ کاٹنا وحشیانہ سزا ہے اگر قید کا انتظام ہے تو ہاتھ کاٹنا جائز نہیں۔ (ج ۲ ص ۲۰۳)

غیر مسلم کی حکومت میں رہ کر شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا جائز نہیں حکومت کے قانون کے مطابق فیصلہ واجب ہے۔ (ج ۲ص ۲۰۷)

حشر ونشر کی کوئی حقیقت نہیں۔ (ج ۲ مطبوعہ انسٹیٹیوٹ پریس علی گڈھ ص ۱۲۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن جانا اور ید بیضا کا معجزہ صرف تخیل کا کرشمہ تھا۔ (ج ۳ص ۲۲۲)

اصحاف کہف کا صدیوں تک غار میں سونا یہ غلط ہے۔ (ج ۶ص ۱۵)

محشر میں شفاعت اور شفاعت کی اجازت اس کی کوئی حقیقت نہیں[۱]۔ (ج ۶ص ۱۴۰،۱۴۱)

قرآن خدا کا کلام نہیں

قرآن جس کو ہم خدا کا کلام کہتے ہیں سرسیّد اس کو تسلیم نہیں کرتے، سرسیّد کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''جس طرح سونے کی حالت میں تعلقات ظاہری منقطع ہوجاتے ہیں اور جس میں انسان کو انہماک ہے وہی خیالات مجسم صورت میں انسان کو دکھائی دیتے ہیں، وہی حالت انسان پر بیداری میں حالت استغراق اور انہماک میں طاری

۱۔ امداد الفتاویٰ جلد ششم مرتبہ مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند شائع کردہ مکتبہ دارالعلوم کراچی ص ۲۸۷ تا ۲۹۷

ہوتی ہے اور بیداری میں بھی اسی طرح سب چیزیں اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے جیسے کہ حالت خواب میں دیکھتا ہے وہ بن آواز دینے والے کے سنتا ہے، بغیر کسی موجود فی الخارج کے موجود فی الخارج دیکھتا ہے، بغیر کسی موجود ہونے، کسی بات کہنے والے کے ایک وجود کو متکلم پاتا ہے، چونکہ ذات پاک انبیاء کی بہت زیادہ مقدس اور منہمک فی اللہ اور فی صفات اللہ ہوتی ہے ان کو کامل استغراق فی ذات اللہ اور فی صفات للہ ہوتی ہے اسی استغراق اور انہماک کے سبب کبھی بغیر آواز کرنے والے کے آواز سنتے ہیں اور بغیر کسی موجود کے ایک موجود کو پاتے ہیں جو ان سے اور وہ ان سے کلام کرتے ہیں اسی حالت کے واقعات ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فرشتہ آدمی کی صورت میں میرے سامنے آتا ہے، مجھ سے بات کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے اس کو یاد کرلیتا ہوں[۱]۔''

یعنی نہ کوئی وحی لانے والا ہے نہ کوئی بھیجنے والا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں جو خیالات ہیں حالتِ استغراق میں وہی الفاظ کی شکل اختیار کرلیتے ہیں خارج میں کچھ نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ سارا قرآن اسی طرح مرتب ہوا ہوگا تو پھر اس کو خدا کا کلام کہنا کیسے درست ہوگا۔ حضورؐ کے استغراق وانہماک کی حالت میں جو باتیں زبان مبارک سے نکلیں وہی وحی ہے، وہی قرآن ہے، گویا سرسیّد کے نزدیک نبوت نعوذ باللہ جنون اور پاگل پن کی قسم ہے، اس کے بعد کوئی تبصرہ فضول ہے، ان حقائق کے بعد بھی اگر کوئی شخص سرسیّد کو مسلمانوں کا مسیحا کہتا ہے تو یقین کرلیجئے کہ وہ شخص پتھر کو بھی خدا مان سکتا ہے۔''

۱۔ تہذیب الاخلاق ج ۲ شمارہ نمبر ۳ دورسوم بحوالہ مقالات سرسیّد از مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۳۲،۱۳۳۔